رجسٹرڈ ایل نمبر ۷۴۳۰

جلد ۵۳ عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور پاکستان

سالانہ چندہ ۶ روپے قیمت فی پرچہ دس آنے

خـــالی صفحـــه

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۶	بابت ماہ ستمبر ۱۹۶۰ء	جلد ۵۴

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن
اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

پاکستان چونکہ ہندی مسلمانوں کی دینی بیداری کا مظہر ہے اس لیے اس کے معرض وجود میں آنے کے ساتھ ہی اس کے اربابِ بست وکشاد نے "تجدید واحیائے دین" کی طرف توجہ دینا شروع کی۔ گذشتہ تیرہ سالوں میں شاید ہی کوئی سربراہ ایسا ہوا ہے جس نے اس اہم موضوع پر اظہارِ خیال نہ کیا ہو۔ کارپردازانِ مملکت کا یہ طرزِ عمل اس ملک کے رہنے والوں کی ملی امنگوں کے عین مطابق ہے۔ اگر کوئی قوم جان ومال، عزت وآبرو کے زیاں سے ایک خطۂ ارضی محض اس لیے حاصل کرتی ہے کہ وہ اسے اسلام کی تجربہ گاہ بنائے تو اُسے اس مقصد کے حصول کے بعد بجا طور پر یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے سربراہوں سے یہ دریافت کرے: حضور آپ کی یہ ساری تگ ودو ناز اپنی جگہ صحیح اور درست سہی لیکن براہِ کرم یہ تو فرمائیں کہ آپ نے اُس بنیادی مقصد کے لیے کیا کچھ کیا ہے جس کے لیے دراصل یہ ملک حاصل کیا گیا تھا۔ باقی رہیں یہ معاشی منصوبہ بندیاں اور سیاسی سرگرمیاں ان کے لیے تو متحدہ ہندوستان میں بھی کافی گنجائش موجود تھی۔

پاکستان کے ایک عام مسلمان کے اس فطری سوال سے اس مملکت کے عمائدنہ تو کبھی غافل ہوئے ہیں اور نہ فی الواقع غافل ہو سکتے ہیں۔ اسی سوال کا جواب فراہم کرنے کے لیے اس ملک میں اسلامی ثقافت کے کئی ایک ادارے قائم ہوئے جنہوں نے اسلام کے مختلف پہلوؤں پر عصرِ حاضر کے تقاضوں کے تحت روشنی ڈالی۔ اسی غرض کے لیے یہاں سرکاری سرپرستی میں سیرت کمیٹیوں کی تشکیل کی گئی جنہوں نے بڑے تزک واحتشام سے جلسے کیے اور جلوس نکالے۔ پھر اسی

مقصد کی خاطر یہاں بین الاقوامی سطح پر مجالس مذاکرہ منعقد ہوئیں جن میں پاکستان اور بیرونِ پاکستان کے اہلِ علم نے شرکت کی اور بتایا کہ اسلام دورِ جدید میں کس طرح ایک رہنما قوت بن سکتی ہے ۔

احیائے اسلام کے لیے سرکاری سرپرستی میں جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے بالکل ناکافی ہے جو اس قوم کے پیشِ نظر ہے ۔ اس قسم کی نیم دلانہ کوششیں کبھی بھی کسی ملت کے اندر فکر و نظر کا کوئی ایسا زبردست انقلاب پیدا نہیں کر سکتیں جو اس کے افراد کو ایک خاص نصب العین کے پُر جوش مبلغین اور علمبردار بنا دیں ۔ ان سے وقتی جوش و خروش تو پیدا کیا جا سکتا ہے لیکن اسلام کے لیے فضا ہموار نہیں ہو سکتی ۔

پھر جب ہم احیائے دین کے لیے ان " ناکافی اور نیم دلانہ " کوششوں کا بھی جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں فوراً یہ احساس ہو جاتا ہے کہ یہ کوششیں دین کے لیے جزوی طور پر بھی مفید اور کارآمد نہیں اور ان سے اُس حد تک بھی دین کو فائدہ حاصل نہیں ہُوا جس حد تک کہ پہنچانا مقصود تھا ۔ انہوں نے دین کو قوتِ فکر و عمل بنانے کی بجائے اسے بازیچۂ اطفال بنا دیا ہے جس سے مسلمانوں کے اندر ایک زبردست ذہنی خلفشار رونما ہُوا ہے ۔ سرکاری مالیات اور قوتوں کا یہ افسوسناک زیاں گہری توجہ کا مستحق ہے اور یہ اندوہناک صورتِ حال ہم میں سے ہر فرد سے اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ہم اس معاملے پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور سوچیں کہ آخر اس میدان میں حکومت اور اسلامی ثقافت کے ان بڑے بڑے اداروں کو کیوں کامیابی نصیب نہیں ہوئی ۔

اس ناکامی کی سب سے بڑی وجہ ہمارے نزدیک تجدید و احیائے دین کے کام سے ناواقفیت ہے جو لوگ اس عزم کے ساتھ کوشش کر رہے ہیں اُن کا اوّلین فرض یہ ہے کہ وہ ایک طرف تو عالمِ اسلام میں پھیلی ہوئی مختلف دینی و اخلاقی بیماریوں اور کمزوریوں کو دُور کرنے کی سعی کریں اور دوسری

طرف اپنی ایمانی قوت اور دماغی صلاحیت سے دین میں ادنیٰ تحریف و ترمیم قبول کیے بغیر اسلامی اقدار کو اس دنیا میں نافذ کرنے کا منصوبہ بنائیں تاکہ شوخ اور پُرجوش مغرب کے چیلنج کا بڑی کامیابی کے ساتھ جواب دیا جا سکے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ کام جاہلیت اور اسلام کے مابین مختلف نوعیتوں کی مصالحتیں قائم کرنے سے تو سرانجام پا جا سکتا ہے، بلکہ اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی صحیح صورت صرف ایک ہی ہے کہ اسلام کو جاہلیت کے تمام اجزاء سے پاک کیا جائے اور اپنی خالص صورت میں پھر سے اسے فروغ دینے کی کوشش کی جائے۔ اس نقطۂ نظر سے تجدید دین جاہلیت کے مقابلے میں ایک سخت غیر مصالحت پسندانہ کام ہے اور کسی ادنیٰ سے ادنیٰ جزو میں بھی جاہلیت کی موجودگی کو گوارا نہیں کر سکتا۔

جس دین کو ہم دنیا میں زندہ کرنے کے متمنی ہیں اگر اُس دین ہی میں تحریف و تاویل کا سلسلہ شروع کر دیا جائے تو پھر وہ ایک انقلاب انگیز قوت فکر و عمل کس طرح بن سکتا ہے۔ اُس کی حیثیت تو محض جاہلیت کے ایک وفادار خادم کی سی ہو گی جس کا فرض اپنی مالکہ کے ہر حکم کی تعمیل کرنا اور اس کے ہر فیصلے کی تائید کرنا ہے۔

مختلف مذاہب کی تاریخ پر ایک نگاہ دوڑائیے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ تحریف و تاویل کا یہ سلسلہ کسی منزل پر رکنے نہیں پاتا۔ کسی دین کے علمبردار جب ایک مرتبہ اپنے اصل مقام سے لڑھکنا شروع کرتے ہیں تو پھر مسلسل پھسلتے ہی چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ایک ایسے پست مقام پر گر جاتے ہیں جس میں انہیں اپنے دین کے اساسی تصورات تک کو بچانا مشکل ہوتا ہے اور اُن کے ذہن سے اپنے مذہب کی وہ امتیازی حیثیت ختم ہو جاتی ہے جس کی بنا پر انہوں نے اسے اپنایا تھا۔ ایک فوج کے لیے تو عین ممکن ہے کہ وہ چند قدم پسپا ہونے کے بعد پھر سے عزم صمیم کے ساتھ دشمن پر حملہ آور ہو اور میدان جیت لے لیکن دین کے علمبرداروں کے لیے یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ جاہلی افکار و نظریات سے خود مغلوب ہو جانے کے بعد بھی اپنے اس دین کو ایک

زندہ قوت بنانے میں کامیاب ہو جائیں۔ دین کے اندر مصالحت جو دراصل ذہنی شکست اور عملی کمزوری کا ہی دوسرا نام ہے، ایک ملت کے لیے بربادی اور موت کا پیغام ہوتی ہے جس وقت ذہن اس طرف مائل ہو بس سمجھ لیجیے کہ اس قوم کے اندر اب داعی کی حیثیت سے زندہ رہنے کا جذبہ ختم ہو گیا ہے اور اُس نے از خود قیادت کا منصب چھوڑ کر مقتدی بننا پسند کر لیا ہے۔

اس مصالحت پسندانہ روش سے ہو سکتا ہے کہ ذہنی اعتبار سے ایک مغلوب و مفلوج قوم کو چند روز کے لیے یہ کہنے کا موقع میسر آ جائے کہ ہم وقت کے تقاضوں کو خوب سمجھتے ہیں ہم ترقی پسند ہیں ہم ہر سانچے میں بڑی آسانی کے ساتھ ڈھل سکتے ہیں اور ہم دنیا کی "ترقی یافتہ" قوموں کے ساتھ قدم ملا کر بڑھنے کی قوت و طاقت رکھتے ہیں لیکن یہ محض فریب نفس ہے اور حقائق اس کا پردہ بہت جلد چاک کر دیتے ہیں۔ تاریخ کے اوراق اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ آج تک دنیا کی کسی قوم نے ذہنی غلامی کو قبول کر کے کبھی اس کرۂ ارضی میں اپنے لیے عزت و وقار کا مقام حاصل نہیں کیا۔ مصر، ایران، ترکی، انڈونیشیا میں سے آخر کونسا ایسا ملک ہے جس کے رہنے والوں نے مغربی افکار و نظریات کو بڑے ذوق و شوق سے قبول نہیں کیا اور مغربی تہذیب و تمدن پر پروانہ وار نہیں گرے، لیکن اس دنیا میں ان کی جو قدر و منزلت ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ لاف و گزاف کے رسیا اپنے متعلق جو چاہے کہتے رہیں اور اپنے مصاحبین میں بیٹھ کر اپنے آپ کو برابر یہ باور کرانے کی کوشش کرتے رہیں کہ ہمارا اقبال عروج پر ہے، آج امریکہ کے ایک پرچہ میں ہمارا فوٹو شائع ہوا ہے یا انگلستان کے ایک اخبار نویس نے ہماری ترقی پسندی کی داد دی ہے۔ لیکن وہ لوگ جن کے ظرف چھوٹے نہیں ہوتے، جن کی نگاہیں دُور رس ہوتی ہیں اور جو خواب خیال کی دنیا میں بسنے کی بجائے حقائق کا سامنا کرنے کی ہمت رکھتے ہیں، وہ ان ممالک کی قدر و قیمت سے پوری طرح واقف ہیں اور اس امر کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ مجلسِ اقوام میں انہیں کونسا مقام حاصل ہے۔

باقی رہا وقتی تقاضوں کا خوف تو یہ محض ایک واہمہ ہے۔ خدائے لم یزل نے وقت کا ایک ہی قاضی مقرر کیا ہے اور وہ اسلام اور صرف اسلام ہے، جسے آدم علیہ السلام کے زمین پر اتارنے کے ساتھ ہی اس کرۂ ارضی پر نازل کیا گیا تھا۔ یہ قاضی ہر دور اور عہد میں ہر ملک اور طبقے میں، ہر قسم کے معاشی اور سیاسی حالات میں اپنا بے لاگ فیصلہ سناتا ہے اور نہ صرف فیصلہ سناتا ہے بلکہ ہمیں اس بات کی بھی دعوت دیتا ہے کہ اُس کے فیصلوں کی روشنی میں ہم انسانیت کی تشکیل کریں۔ اس منصف اور عادل کے فیصلوں کے خلاف نوعِ بشری آج تک جو کچھ کرتی رہی ہے اور قیامت تک جو کچھ کرے گی وہ سراسر غلط اور باطل ہے۔ اس لیے ہر دور میں وقت کا تقاضا صرف ایک ہی ہے کہ ہم اپنے سارے معاملات کو دینِ حق کے فرامین و احکام کے مطابق ڈھالیں۔ اسی جد و جہد کو ہماری اصطلاح میں "تجدید و احیائے دین" کہا جاتا ہے۔

اس منصب پر آج تک جو حضرات فائز ہوئے ہیں اور جن افراد نے بھی اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے انہوں نے کفر کے ساتھ کبھی مصالحت اور سودے بازی نہیں کی بلکہ ہمیشہ اسے مٹانے کی سعی کی۔ کفر و الحاد کے وقتی اور پُر جوش نعروں کو صورِ اسرافیل سمجھ کر ان سے خوف زدہ اور مرعوب ہو جانا اُس ملت کو کسی طرح زیب نہیں دیتا جس کے کانوں میں ہر وقت لَا تَخَفْ کی صدا آ رہی ہو اور جسے واضح الفاظ میں اس امر کی بشارت دی گئی ہو: لَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ۔

یہ محض ہمارے اس دور کی کرشمہ سازی ہے جس نے تجدید و احیائے دین اور کفر و الحاد کے ساتھ ہم آہنگی کے درمیان جو بیّن فرق ہے اُسے یکسر نظر انداز کر کے ان دونوں کو ایک ہی چیز سمجھ لیا ہے۔ دورِ جدید کے مجددین نے یہ فرض کر لیا ہے کہ اسلام کے احیا کے یہ معنی ہیں کہ کفر و الحاد اسلام کے جن قوانین کو زندہ رہنے کا حق دیتا ہے انہیں زندہ رکھا جائے اور جنہیں وہ برداشت نہیں کر سکتا انہیں خود اپنے ہاتھوں سے مٹا ڈالا جائے۔ تجدید سے ان لوگوں کی مراد یہ ہے کہ اسلام

میں ہر اُس اصول کو داخل کیا جائے جس کا عہدِ حاضر کی جاہلیت تقاضا کرے اور اسلام کے ہر اُس حصّے کو حذف کر دیا جائے جو کفر سے ٹکراتا ہو۔ آپ ان متجددین کے سارے تجدیدی کارناموں پر ایک نگاہ دوڑائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کی ساری تگ و دو صرف جاہلانہ افکار و نظریات کو سندِ جواز فراہم کرنے تک محدود ہے۔ ان لوگوں نے غلطی سے یہ سمجھ رکھا ہے کہ دورِ جدید میں اگر کوئی نظامِ حیات پنپ سکتا ہے تو وہ صرف وہی ہے جس میں مادیت، نفس پرستی، تعیشات اور عقلیت پرستی کی اتنی ہی گنجائش موجود ہو جو مغربی تہذیب و تمدن میں موجود ہے اور ان مختلف میدانوں میں اگر ہم ذرا بھی پیچھے رہ گئے تو پھر اسلام کے زندہ رہنے اور بڑھنے کے سارے امکانات ختم ہو جائیں گے چنانچہ دیکھیے کبھی یہ حضرات سُود کی حلّت کے لیے مختلف صورتیں نکالتے ہیں، کبھی بے حجابی کے لیے وجہِ جواز فراہم کی جاتی ہے، کبھی موسیقی اور کبھی مصوری کو اجزائے دین ثابت کرنے کی سعی و جہد ہوتی ہے۔ یہ اور بیسیوں ایسے مسائل ہیں جنہیں یہ ماہرینِ فن "مشرف بہ اسلام" کر رہے ہیں۔

ان حضرات کی نیتیں خواہ کتنی ہی مخلصانہ اور پاک ہوں مگر اسلام کے معاملے میں ان کی اس مصالحت پسندانہ اور معذرت خواہانہ روش سے دین کبھی زندہ نہیں ہو سکتا۔ دین کو زندہ کرنے اور اُسے ایک طاقتور تحریکِ فکر و عمل بنانے کی واحد صورت یہ ہے کہ مسلمانوں کو مغربی الحاد و زندقہ کے اثرات سے بچایا جائے اور صدیوں کی ذہنی اور سیاسی غلامی نے اُن کے اندر جو برائیاں پیدا کی ہیں ان کو مٹانے کے پورے پورے انتظامات ہوں۔ پھر ریب و تشکیک نے اُن کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے اندر جس قسم کی ابن الوقتی اور بے اصولا پن پیدا کر دیا ہے اُسے اصول پرستی سے بدلنے کی کوشش کی جائے اور سب سے آخر میں ان کے اندر یہ جرأتِ ایمانی بیدار کی جائے کہ وہ ہر اُس جہالت کے مقابلے میں جو دنیا میں موجود ہے، مردانہ وار صف آرا ہوں، اور اس طرح اُس تہذیبِ جدید کے خلاف جس نے نئی قسم کی وحشت پیدا کی ہے، اور اُس ترقی کے خلاف جس میں جہنم کی آنچوں کا اثر ہے وہ نبرد آزما ہونا سیکھیں۔ یہ کام بڑا صبر آزما اور

بڑا مشکل ہے لیکن دین اسی صورت میں زندہ ہو سکتا ہے۔

یوں تو افکار و نظریات کی سودا بازیاں کسی دور میں بھی مفید نہیں ہوتیں لیکن یہ اُن حالات میں خصوصی طور پر بڑی خطرناک ہوتی ہیں جن میں ایک قوم ذہنی مرعوبیت میں گرفتار ہو کر اس قسم کے سودے کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ اس کا سب سے بڑا نقصان ملت کو یہ پہنچتا ہے کہ اس کے افراد کی نظر میں حق و باطل کے پیمانے یکسر بدل جاتے ہیں۔ وہ غلطی سے یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ حق اُن کے پاس نہیں بلکہ غیروں کے پاس ہے اُن کے جن افکار و نظریات کی تائید دوسرے کریں وہ صحیح ہیں، اور جو تصورات و اعتقادات دوسروں کی نگاہ میں صحیح نہ ہوں وہ لازمی طور پر غلط ہیں اور اس وجہ سے انہیں اپنا کر ہم کوئی ترقی نہیں کر سکتے۔

کچھ دیر تک تو اپنے افکار کو دوسروں کے تصورات کے مطابق ڈھالنے کی جدوجہد ہوتی ہے اور اسی کو "خدمتِ دین" خیال کر لیا جاتا ہے لیکن تجربہ شاہد ہے کہ نہ تو یہ گاڑی دیر تک چلتی ہے اور نہ ہی اس کام کو نئی پود عزت کی نگاہ سے دیکھنے پر آمادہ ہوتی ہے۔

افکار و نظریات کو کھینچ تان کر بالکل متضاد تصورات کے ساتھ ہم آہنگ کرنا کوئی ایسا آسان کام نہیں جو ہنسی خوشی سرانجام دیا جا سکتا ہے۔ ایک ایسا نظامِ حیات جو زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہو اور جس کا ہر گوشہ اس کے بنیادی تصور کا عکس ہو وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے ہمیشہ یک رنگ ہوتا ہے۔ اُس کے کسی گوشے میں تبدیلی کے یہ معنی ہیں کہ اسے دوسرے حصوں سے بالکل کاٹ کر الگ کر دیا جائے اور اپنے اُس منبع سے بھی اُس کا تعلق منقطع ہو جائے جو اُسے زندگی بخشتا ہے۔ کسی زندہ نظامِ حیات کے جس عضو کے ساتھ یہ سلوک ہو گا وہ لوگوں کے اندر قوت و طاقت کا ذریعہ بننے کی بجائے اُن کے لیے وبالِ جان بنے گا اور جو قوم اسے اس مردہ صورت میں اپنے ساتھ چپکائے رکھنے پر مُصر ہو گی اس کا بھی وہی حشر ہو گا جو متعفن لاش کو سینے سے لگانے کا ہوتا ہے۔

رمضان ۶۴ھ

تفہیم القرآن

العنکبوت

(۲)

اور ابراہیم کو بھیجا[۲۶] جبکہ اس نے اپنی قوم سے کہا: "اللہ کی بندگی کرو اور اُس سے ڈرو۔[۲۷] یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ تم اللہ کو چھوڑ کر جنہیں پوج رہے ہو وہ تو محض بت ہیں اور تم ایک جھوٹ گھڑ رہے ہو[۲۸]۔ در حقیقت اللہ کے سوا جن کی تم پرستش کرتے ہو وہ تمہیں کوئی رزق بھی دینے کا اختیار نہیں رکھتے۔ اللہ سے رزق مانگو اور اسی کی بندگی کرو اور اس کا شکر ادا کرو، اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو[۲۹]۔ اور اگر تم جھٹلاتے ہو تو تم سے پہلے بہت سی قومیں

---

[۲۶] تقابل کے لیے ملاحظہ ہو البقرہ رکوع ۱۵-۱۶-۳۵ - آل عمران ۷- الانعام ۹- ہود ۷- ابراہیم ۶ الحجر ۴- مریم ۳- الانبیاء ۵- الشعراء ۵- الصافات ۳- الزخرف ۳- الذاریات ۲-

[۲۷] یعنی اُس کے ساتھ شرک اور اس کی نافرمانی کرنے سے ڈرو۔

[۲۸] یعنی تم یہ بت نہیں گھڑ رہے ہو بلکہ ایک جھوٹ گھڑ رہے ہو۔ ان بتوں کا وجود خود ایک جھوٹ ہے۔ اور پھر تمہارے یہ عقائد کہ یہ دیویاں اور دیوتا ہیں، یا خدا کے اوتار یا اس کی اولاد ہیں، یا خدا کے مقرب اور اس کے ہاں شفیع ہیں، یا یہ کہ ان میں سے کوئی شفا دینے والا اور کوئی اولاد بخشنے والا اور کوئی روزگار دلوانے والا ہے، یہ سب جھوٹی باتیں ہیں جو تم لوگوں نے اپنے وہم و گمان سے تصنیف کر لی ہیں۔ حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ یہ محض بُت ہیں بے جان، بے اختیار اور بے اثر۔

[۲۹] ان چند فقروں میں حضرت ابراہیمؑ نے بُت پرستی کے خلاف تمام معقول دلائل سمیٹ کر رکھ دیئے ہیں۔ کسی کو معبود بنانے کے لیے لامحالہ کوئی معقول وجہ ہونی چاہیے۔ ایک معقول وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی ذات میں معبودیت کا کوئی استحقاق رکھتا ہو۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ آدمی کا خالق ہو اور آدمی اپنے وجود کے لیے اس کا رہینِ منت ہو۔ تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ آدمی کی پرورش

جھٹلا چکی ہیں[۳۵]، اور رسول پر صاف صاف پیغام پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہے[۳۶]
کیا اِن لوگوں نے کبھی دیکھا ہی نہیں ہے کہ اللہ کس طرح خلق کی ابتدا کرتا ہے

کا سامان کرتا ہو اور اسے رزق یعنی متاعِ زیست بہم پہنچاتا ہو۔ چوتھی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آدمی کا مستقبل اس کی عنایات سے وابستہ ہو اور آدمی کو اندیشہ ہو کہ اس کی ناراضی مول لیکر وہ اپنا انجام خراب کر لیگا۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا کہ ان چاروں وجوہ میں سے کوئی وجہ بھی بت پرستی کے حق میں نہیں ہے بلکہ ہر ایک خالص خدا پرستی کا تقاضا کرتی ہے۔ "یہ محض بت ہیں" کہہ کر انہوں نے پہلی وجہ کو ختم کر دیا، کیونکہ جو نرا بُت ہو اس کو معبود ہونے کا آخر کیا ذاتی استحقاق حاصل ہو سکتا ہے۔ پھر یہ کہہ کر "تم ان کے خالق ہو" دوسری وجہ بھی ختم کر دی ۔ اس کے بعد تیسری وجہ کو یہ فرما کر ختم کیا کہ وہ تمہیں کسی نوعیت کا کچھ بھی رزق نہیں دے سکتے۔ اور آخری بات یہ ارشاد فرمائی کہ تمہیں پلٹنا تو خدا کی طرف ہے نہ کہ ان بتوں کی طرف، اس لیے تمہارا انجام اور تمہاری عاقبت سنوارنا یا بگاڑنا بھی ان کے اختیار میں نہیں صرف خدا کے اختیار میں ہے۔ اس طرح شرک کا پورا ابطال کر کے حضرت والا نے یہ بات ان پر واضح کر دی کہ جتنے وجوہ سے بھی انسان کسی کو معبود قرار دے سکتا ہے وہ سب کے سب اللہ وحدہٗ لاشریک کے سوا کسی کی عبادت کے مقتضی نہیں ہیں۔

[۳۵] یعنی اگر تم میری دعوتِ توحید کو اور اس خبر کو کہ تمہیں اپنے رب کی طرف پلٹنا اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہے، جھٹلاتے ہو تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تاریخ میں اس سے پہلے بھی بہت سے نبی (مثلاً نوح، ہود، صالح علیہم السلام وغیرہ) یہی تعلیم لیکر آچکے ہیں اور ان کی قوموں نے بھی ان کو اسی طرح جھٹلایا ہے۔ اب تم خود دیکھ لو کہ انہوں نے جھٹلا کر ان نبیوں کا کچھ بگاڑا یا اپنا انجام خراب کیا۔

[۳۶] یہاں سے لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (ان کے لیے دردناک سزا ہے) تک ایک جملہ معترضہ ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے قصے کا سلسلہ توڑ کر اللہ تعالیٰ نے کفارِ مکہ کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا گیا ہے۔ اس اعتراضی تقریر کی مناسبت یہ ہے کہ کفارِ مکہ، جنہیں سبق دینے کے لیے یہ قصہ سنایا جا رہا ہے

پھر اس کا اعادہ کرتا ہے، یقیناً یہ (اعادہ تو) اللہ کے لیے آسان تر ہے[۳۲]۔ ان سے کہو کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ اس نے کس طرح خلق کی ابتدا کی ہے، پھر اللہ بار دیگر بھی زندگی بخشے گا۔ یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے[۳۳]۔ جسے چاہے سزا دے اور جس پر چاہے رحم فرمائے، اسی کی طرف تم پھیرے جانے والے ہو۔ تم نہ زمین میں عاجز کرنے والے ہو نہ آسمان میں[۳۴]، اور اللہ سے بچانے والا کوئی سرپرست اور مددگار تمہارے لیے

دو بنیادی گمراہیوں میں مبتلا تھے۔ ایک شرک و بت پرستی، دوسرے انکار آخرت۔ ان میں سے پہلی گمراہی کا رد حضرت ابراہیمؑ کی اس تقریر میں آچکا ہے جو اوپر نقل کی گئی ہے۔ اب دوسری گمراہی کے رد میں یہ چند فقرے اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے ارشاد فرما رہا ہے تاکہ دونوں کی تردید ایک ہی سلسلہ کلام میں ہو جائے۔

۳۲ یعنی ایک طرف بے شمار اشیاء عدم سے وجود میں آتی ہیں، اور دوسری طرف ہر نوع کے افراد مٹنے کے ساتھ پھر ویسے ہی افراد وجود میں آتے چلے جاتے ہیں۔ مشرکین اس بات کو مانتے تھے کہ یہ سب کچھ اللہ کی صفت خلق و ایجاد کا نتیجہ ہے۔ انہیں اللہ کے خالق ہونے سے انکار نہ تھا جس طرح آج کے مشرکین کو نہیں ہے۔ اس لیے ان کی اپنی مانی ہوئی بات پر یہ دلیل قائم کی گئی ہے کہ جو خدا تمہارے نزدیک اشیاء کو عدم سے وجود میں لاتا ہے، اور پھر ایک ہی دفعہ تخلیق کر کے نہیں رہ جاتا بلکہ تمہاری آنکھوں کے سامنے مٹ جانے والی اشیاء کی جگہ پھر ویسی ہی اشیاء پے در پے وجود میں لاتا چلا جاتا ہے اس کے بارے میں آخر تم نے یہ کیوں سمجھ رکھا ہے کہ تمہارے مر جانے کے بعد وہ پھر تمہیں دوبارہ زندہ کر کے اٹھا کھڑا نہیں کر سکتا۔

۳۳ یعنی جب خدا کی کاریگری سے بار اول کی تخلیق کا تم خود مشاہدہ کر رہے ہو تو تمہیں سمجھنا چاہیے کہ اسی خدا کی کاریگری سے بار دیگر بھی تخلیق ہو گی۔ ایسا کرنا اس کی قدرت سے باہر نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

۳۴ یعنی تم کسی ایسی جگہ بھاگ کر نہیں جا سکتے جہاں اللہ کی گرفت سے بچ نکلو۔ خواہ تم زمین کی تہوں میں کہیں اتر جاؤ یا آسمان کی بلندیوں میں پہنچ جاؤ، بہرحال تمہیں ہر جگہ سے پکڑ لایا جائیگا اور اپنے رب کے

ع نہیں ہے۳۵ ؎ جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا اور اس سے ملاقات کا انکار کیا ہے وہ میری رحمت سے مایوس ہو چکے ہیں۳۶ اور ان کے لیے دردناک سزا ہے۔

پھر۳۷ اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہوں نے کہا قتل کر دو اسے

سامنے تم حاضر کر دیے جاؤ گے۔ یہی بات سورۂ رحمٰن میں جنوں اور انسانوں کو خطاب کرتے ہوئے چیلنج کے انداز میں فرمائی گئی ہے کہ تم خدا کی خدائی سے اگر نکل سکتے ہو تو ذرا نکل کر دکھاؤ، اس سے نکلنے کے لیے زور چاہیے اور وہ زور تمہیں حاصل نہیں ہے، اس لیے تم ہرگز نہیں نکل سکتے۔ یَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ (رکوع ۲)۔

۳۵ ؎ یعنی نہ تمہارا اپنا زور اتنا ہے کہ خدا کی پکڑ سے بچ جاؤ، اور نہ تمہارا کوئی ولی و سرپرست یا مددگار ایسا زورآور ہے کہ خدا کے مقابلے میں تمہیں پناہ دے سکے اور اس کے مواخذہ سے تمہیں بچا لے۔ ساری کائنات میں کسی کی یہ مجال نہیں ہے کہ جن لوگوں نے کفر و شرک کا ارتکاب کیا ہے، جنہوں نے احکامِ خداوندی کے آگے جھکنے سے انکار کیا ہے جنہوں نے جرأت و جسارت کے ساتھ خدا کی نافرمانیاں کی ہیں اور اس کی زمین میں ظلم و فساد کے طوفان اٹھائے ہیں، ان کا حمایتی بن کر اٹھ سکے اور خدا کے فیصلۂ عذاب کو اُن پر نافذ ہونے سے روک سکے، یا خدا کی عدالت میں یہ کہنے کی ہمت کر سکے کہ یہ میرے ہیں اس لیے جو کچھ بھی انہوں نے کیا ہے اسے معاف کر دیا جائے۔

۳۶ ؎ یعنی ان کا کوئی حصہ میری رحمت میں نہیں ہے۔ ان کے لیے کوئی گنجائش اس امر کی نہیں ہے کہ وہ میری رحمت میں سے حصہ پانے کی امید رکھ سکیں۔ ظاہر بات ہے کہ جب انہوں نے اللہ کی آیات کو ماننے سے انکار کیا تو خود بخود وہ اُن وعدوں سے فائدہ اٹھانے کے حق سے بھی وہ دست بردار ہو گئے جو اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے والوں سے کیے ہیں۔ پھر جب انہوں نے آخرت کا انکار کیا اور یہ تسلیم ہی نہ کیا کہ انہیں کبھی اپنے خدا کے حضور پیش ہونا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے خدا کی بخشش و مغفرت کے ساتھ کوئی رشتۂ امید سرے سے وابستہ ہی نہیں کیا ہے۔ اس کے بعد جب اپنی توقعات کے خلاف وہ عالمِ آخرت میں آنکھیں کھولیں گے اور اللہ کی اُن آیات کو بھی اپنی آنکھوں سے سچا اور برحق دیکھ لیں گے

یا جلا ڈالو اس کو۔[۳۸] آخر کار اللہ نے اسے آگ سے بچا لیا،[۳۹] یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان

جنہیں وہ جھٹلا چکے تھے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہاں وہ رحمتِ الٰہی میں سے کوئی حصہ پانے کے امیدوار ہو سکیں۔

۳۷؎ یہاں سے پھر سلسلۂ کلام حضرت ابراہیمؑ کے قصّے کی طرف مڑتا ہے۔

۳۸؎ یعنی حضرت ابراہیمؑ کے معقول دلائل کا کوئی جواب ان کے پاس نہ تھا۔ ان کا جواب اگر تھا تو یہ کہ کاٹ دو اس زبان کو جو حق بات کہتی ہے اور جینے نہ دو اس شخص کو جو ہماری غلطی ہم پر واضح کرتا ہے اور ہمیں اس سے باز آنے کے لیے کہتا ہے۔ "قتل کرو یا جلا ڈالو" کے الفاظ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ پورا مجمع اس بات پر تو متفق تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کو ہلاک کر دیا جائے، البتہ ہلاک کرنے کے طریقے میں اختلاف تھا۔ کچھ لوگوں کی رائے یہ تھی کہ قتل کیا جائے، اور کچھ کی رائے یہ تھی کہ زندہ جلا دیا جائے تاکہ ہر اُس شخص کو عبرت حاصل ہو جسے آئندہ کبھی ہماری سرزمین میں حق گوئی کا جنون لاحق ہو۔

۳۹؎ اس فقرے سے خود بخود یہ بات نکلتی ہے کہ ان لوگوں نے آخر کار ابراہیم علیہ السلام کو جلانے کا فیصلہ کیا تھا اور وہ آگ میں پھینک دیئے گئے تھے یہاں بات صرف اتنی کہی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو آگ سے بچا لیا۔ لیکن سورۃ الانبیاء میں صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ آگ اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت ابراہیمؑ کے لیے ٹھنڈی اور غیر مضر ہو گئی، قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ (رکوع ۵) "ہم نے کہا کہ اے آگ ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیمؑ پر"۔ ظاہر ہے کہ اگر اُن کو آگ میں پھینکا ہی نہ گیا ہو تو آگ کو یہ حکم دینے کے کوئی معنی نہیں ہیں کہ تو اُن پر ٹھنڈی ہو جا اور ان کے لیے سلامتی بن جا۔ اس سے یہ بات صاف طور پر ثابت ہوتی ہے کہ تمام اشیاء کی خاصیتیں اللہ تعالیٰ کے حکم پر مبنی ہیں، اور وہ جس وقت جس چیز کی خاصیت کو چاہے بدل سکتا ہے۔ معمول کے مطابق آگ کا عمل یہی ہے کہ وہ جلائے اور ہر آتش پذیر چیز اس میں پڑ کر جل جائے۔ لیکن آگ کا یہ معمول اُس کا اپنا قائم کیا ہوا نہیں ہے بلکہ خدا کا قائم کیا ہوا ہے۔ اور اس معمول نے خدا کو پابند نہیں کر دیا ہے کہ وہ اس کے خلاف کوئی حکم نہ دے سکے۔ وہ اپنی آگ کا مالک ہے۔ کسی وقت بھی وہ اسے حکم دے سکتا ہے کہ وہ جلانے کا عمل چھوڑ دے۔ کسی وقت بھی وہ اپنے ایک اشارے سے آتشکدے کو گلزار میں تبدیل کر سکتا ہے۔

لوگوں کے لیے جو ایمان لانے والے ہیں[۳۹]۔ اور اس نے کہا[۴۰] "تم نے دنیا کی زندگی میں تو اللہ کو چھوڑ کر بتوں کو اپنے درمیان محبت کا ذریعہ بنا لیا ہے[۴۱] مگر قیامت کے روز تم ایک دوسرے کا انکار اور ایک دوسرے پر لعنت کرو گے[۴۲] اور آگ تمہارا ٹھکانا ہو گی اور

یہ غیر معمولی خرقِ عادت اس کے ہاں روز روز نہیں ہوتے کسی بڑی حکمت اور مصلحت کی خاطر ہی ہوتے ہیں۔ لیکن معمولات کو، جنہیں روز مرہ دیکھنے کے ہم خوگر ہیں، اس بات کے لیے ہر گز دلیل نہیں ٹھیرایا جا سکتا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اُن سے بندھ گئی ہے اور خلافِ معمول کوئی واقعہ اللہ کے حکم سے بھی نہیں ہو سکتا۔

[۳۹] یعنی نشانیاں ہیں اس بات میں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خاندان، قوم اور ملک کے مذہب کی پیروی کرنے کے بجائے اُس علمِ حق کی پیروی کی جس کی رُو سے انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ شرک باطل ہے اور توحید ہی حقیقت ہے۔ اور اس بات میں کہ وہ قوم کی ہٹ دھرمی اور اس کے شدید تعصب کی پروا کیے بغیر اس کو باطل سے باز آجانے اور حق قبول کر لینے کے لیے پیہم تبلیغ کرتے رہے۔ اور اس بات میں کہ وہ آگ کی ہولناک سزا برداشت کرنے کے لیے تیار ہو گئے مگر حق و صداقت سے منہ موڑنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ اور اس بات میں کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم خلیل علیہ السلام تک کو آزمائشوں سے گزارے بغیر نہ چھوڑا۔ اور اس بات میں کہ جب حضرت ابراہیم اللہ کے ڈالے ہوئے امتحان سے کامیابی کے ساتھ گزر گئے تب اللہ کی مدد ان کے لیے آئی اور ایسے معجزانہ طریقہ سے آئی کہ آگ کا الاؤ ان کے لیے ٹھنڈا کر دیا گیا۔

[۴۰] سلسلۂ کلام سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ بات آگ سے بسلامت نکل آنے کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے لوگوں سے فرمائی ہو گی۔

[۴۱] یعنی تم نے خدا پرستی کے بجائے بُت پرستی کی بنیاد پر اپنی اجتماعی زندگی کی تعمیر کر لی ہے جو دنیوی زندگی کی حد تک تمہارا قومی شیرازہ باندھ سکتی ہے۔ اس لیے کہ یہاں کسی عقیدے پر بھی لوگ جمع ہو سکتے ہیں، خواہ حق ہو یا باطل۔ اور ہر اتفاق و اجتماع، چاہے وہ کیسے ہی غلط عقیدے پر ہو، باہم دوستیوں، رشتہ داریوں، برادریوں اور دوسرے تمام مذہبی، معاشرتی و تمدنی اور معاشی و سیاسی تعلقات کے قیام کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

کوئی تمہارا مددگار نہ ہوگا"۔ اس وقت لوطؑ نے اس کو مانا۴۴۔ اور ابراہیمؑ نے کہا میں اپنے رب

۴۳؎ یعنی عقیدۂ باطلہ پر تمہاری یہ ہیئت اجتماعی آخرت میں بنی نہیں رہ سکتی۔ وہاں آپس کی محبت، دوستی، تعاون، رشتہ داری، اور عقیدت وارادت کے صرف وہی تعلقات برقرار رہ سکتے ہیں جو دنیا میں خدائے واحد کی بندگی پر قائم ہوتے ہوں۔ کفروشرک پر جُڑے ہوتے سارے رشتے وہاں کٹ جائینگے ساری محبتیں دشمنی میں تبدیل ہو جائیں گی، ساری عقیدتیں نفرت میں بدل جائیں گی۔ وہاں بیٹے اور باپ، شوہر اور بیوی، پیر اور مرید تک ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں گے اور ہر ایک اپنی گمراہی کی ذمہ داری دوسرے پر ڈال کر پکاریگا کہ اس ظالم نے مجھے خراب کیا اس لیے اسے دوہرا عذاب دیا جائے۔ یہ بات قرآن مجید میں متعدد مقامات پر فرمائی گئی ہے۔ مثلاً سورۂ زخرف میں فرمایا اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَئِذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ (رکوع ۶)۔ "دوست اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے، سوائے متقین کے"۔ سورۂ اعراف میں فرمایا كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا حَتّٰۤى اِذَا ادَّارَكُوْا فِیْهَا جَمِیْعًا قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ (رکوع ۴) "ہر گروہ جب جہنم میں داخل ہوگا تو اپنے پیش رو گروہ پر لعنت کرتا ہوا داخل ہوگا حتیٰ کہ جب سب وہاں جمع ہو جائیں گے تو ہر بعد والا گروہ پہلے گروہ کے حق میں کہے گا کہ اے ہمارے رب، یہ لوگ تھے جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا، لہٰذا انہیں آگ کا دُہرا عذاب دے"۔ اور سورۂ احزاب میں فرمایا وَقَالُوْا رَبَّنَاۤ اِنَّاۤ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِیْلَا رَبَّنَاۤ اٰتِهِمْ ضِعْفَیْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِیْرًا (رکوع ۸)۔ "اور وہ کہیں گے اے ہمارے رب، ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہم کو راہ سے بے راہ کر دیا۔ اے ہمارے رب تو انہیں دہری سزا دے اور ان پر سخت لعنت فرما"۔

۴۴؎ ترتیبِ کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ آگ سے نکل آئے اور انہوں نے اوپر کے فقرے ارشاد فرمائے اُس وقت سارے مجمع میں صرف ایک حضرت لوطؑ تھے جنہوں نے آگے بڑھ کر اُن کو ماننے اور ان کی پیروی اختیار کرنے کا اعلان کیا۔ ہو سکتا ہے کہ اس موقع پر دوسرے بہت

کی طرف ہجرت کرتا ہوں[۴۵]، وہ زبردست ہے اور حکیم ہے[۴۶]۔ اور ہم نے اسے اسحاقؑ اور یعقوبؑ (جیسی اولاد) عنایت فرمائی[۴۷] اور اس کی نسل میں نبوت اور کتاب رکھ دی[۴۸]، اور

سے لوگ بھی اپنے دل میں حضرت ابراہیمؑ کی صداقت کے قائل ہو گئے ہوں۔ لیکن پوری قوم اور سلطنت کی طرف سے دینِ ابراہیم کے خلاف جس غضبناک جذبے کا اظہار اُس وقت سب کی آنکھوں کے سامنے ہوا تھا اُسے دیکھتے ہوتے کوئی دوسرا شخص ایسے خطرناک حق کو ماننے اور اس کا ساتھ دینے کی جرأت نہ کر سکا۔ یہ سعادت صرف ایک آدمی کے حصے میں آئی اور وہ حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے حضرت لوط تھے جنہوں نے ہجرت میں بھی اپنے چچا اور چچی (حضرت سارہ) کا ساتھ دیا۔

یہاں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے جسے رفع کر دینا ضروری ہے۔ ایک شخص سوال کر سکتا ہے کہ کیا اس واقعہ سے پہلے حضرت لوطؑ کافر و مشرک تھے اور آگ سے حضرت ابراہیمؑ کے بسلامت نکل آنے کا معجزہ دیکھنے کے بعد انہیں نعمتِ ایمان میسر آئی؟ اگر یہ بات ہے تو کیا نبوت کے منصب پر کوئی ایسا شخص بھی سرفراز ہو سکتا ہے جو پہلے مشرک رہ چکا ہو؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن نے یہاں فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ کے الفاظ استعمال کیے ہیں جن سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس سے پہلے حضرت لوط خداوند عالم کو نہ مانتے ہوں، یا اس کے ساتھ دوسرے معبودوں کو شریک کرتے ہوں۔ بلکہ ان سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد انہوں نے حضرت ابراہیمؑ کی رسالت کی تصدیق کی اور ان کی پیروی اختیار کر لی۔ ایمان کے ساتھ جب لام کا صلہ آتا ہے تو اس کے معنی کسی شخص کی بات ماننے اور اس کی اطاعت کرنے کے ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ حضرت لوط اس وقت ایک نوعمر لڑکے ہی ہوں اور اپنے ہوش میں ان کو پہلی مرتبہ اس موقع پر ہی اپنے چچا کی تعلیم سے واقف ہونے اور ان کی شانِ رسالت سے آگاہ ہونے کا موقع ملا ہو۔

[۴۵] یعنی اپنے رب کی خاطر ملک چھوڑ کر نکلتا ہوں، اب جہاں میرا رب لے جائیگا وہاں چلا جاؤنگا۔

[۴۶] یعنی وہ میری حمایت و حفاظت پر قادر ہے اور میرے حق میں اس کا جو فیصلہ بھی ہوگا حکمت پر مبنی ہوگا۔

اسے دنیا میں اس کا اجر عطا کیا اور آخرت میں وہ یقیناً صالحین میں سے ہوگا۔[۴۹]
اور ہم نے لوط کو بھیجا[۵۰] جبکہ اس نے اپنی قوم سے کہا: "تم لوگ تو وہ فحش کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا والوں میں سے کسی نے نہیں کیا ہے۔ کیا تمہارا یہ حال ہے کہ

۴۷ حضرت اسحاق بیٹے تھے اور حضرت یعقوب پوتے۔ یہاں حضرت ابراہیمؑ کے دوسرے بیٹوں کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا ہے کہ اولادِ ابراہیمؑ کی مدیانی شاخ میں صرف حضرت شعیب مبعوث ہوئے اور اسماعیلی شاخ میں سرکارِ رسالت مآب محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک ڈھائی ہزار سال کی مدت میں کوئی نبی نہیں آیا۔ اس کے برعکس نبوت اور کتاب کی نعمت حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک مسلسل اس شاخ کو عطا ہوتی رہی جو حضرت اسحٰق علیہ السلام سے چلی تھی۔

۴۸ اس میں وہ تمام انبیاء آ گئے جو نسلِ ابراہیمی کی سب شاخوں میں مبعوث ہوئے ہیں۔

۴۹ مقصودِ بیان یہ ہے کہ بابل کے وہ حکمران اور پنڈت اور پروہت جنہوں نے ابراہیم علیہ السّلام کی دعوت کو نیچا دکھانا چاہا تھا، اور اس کے وہ مشرک باشندے جنہوں نے آنکھیں بند کر کے ان ظالموں کی پیروی کی تھی، وہ تو دنیا سے مٹ گئے اور ایسے مٹے کہ آج دنیا میں کہیں ان کا نام نشان تک باقی نہیں۔ مگر وہ شخص جسے اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے جرم میں ان لوگوں نے جلا کر خاک کر دینا چاہا تھا، اور جسے آخر کار بے سروسامانی کے عالم میں وطن سے نکل جانا پڑا تھا، اس کو اللہ تعالیٰ نے یہ سرفرازی عطا فرمائی کہ چار ہزار برس سے دنیا میں اس کا نام روشن ہے اور قیامت تک رہے گا۔ دنیا کے تمام مسلمان، عیسائی اور یہودی اُس خلیلِ رب العٰلمین کو بالاتفاق اپنا پیشوا مانتے ہیں۔ دنیا کو ان چالیس صدیوں میں جو کچھ بھی ہدایت کی روشنی میسّر آئی ہے اسی ایک انسان اور اس کی پاکیزہ اولاد کی بدولت میسّر آئی ہے۔ آخرت میں جو اجرِ عظیم اس کو ملے گا وہ تو ملے گا ہی، مگر اس دنیا میں بھی اس نے وہ عزت پائی جو حصولِ دنیا کے پیچھے جان کھپانے والوں میں سے کسی کو آج تک نصیب نہیں ہوئی۔

۵۰ تقابل کے لیے ملاحظہ ہو الاعراف رکوع ۱۰۔ ہود، ۷۔ الحجر، ۴-۵۔ الانبیاء ۵۔ الشعراء ۹۔ النمل ۴۔ الصافات ۴۔ القمر ۲۔

مردوں کے پاس جاتے ہو،[51] اور رہزنی کرتے ہو اور اپنی مجلسوں میں بُرے کام کرتے ہو؟[52] پھر کوئی جواب اس کی قوم کے پاس اس کے سوا نہ تھا کہ "لے آ اللہ کا عذاب اگر تو سچا ہے"۔ لوطؑ نے کہا "اے میرے رب اِن مفسد لوگوں کے مقابلے میں میری مدد فرما"۔ ع

اور جب ہمارے فرستادے ابراہیمؑ کے پاس بشارت لیکر پہنچے[53] تو انہوں نے اس سے کہا "ہم اِس بستی کے لوگوں کو ہلاک کرنے والے ہیں[54]" فی الواقع اس کے لوگ سخت ظالم ہو چکے تھے۔ ابراہیمؑ نے کہا "وہاں تو لوط موجود ہے[55]"۔ انہوں نے کہا "ہم خوب

---

[51] یعنی ان سے شہوت رانی کرتے ہو، جیسا کہ سورۂ اعراف میں ہے اَئِنَّکُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ "تم خواہشِ نفس پوری کرنے کے لیے عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس جاتے ہو۔"

[52] یعنی یہ فحش کام چھپ کر بھی نہیں کرتے بلکہ علانیہ اپنی مجلسوں میں ایک دوسرے کے سامنے اس کا ارتکاب کرتے ہو۔ یہی بات سورۂ نمل میں فرمائی ہے اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ "کیا تم ایسے بگڑ گئے ہو کہ دیکھنے والی آنکھوں کے سامنے فحش کاری کرتے ہو؟"

[53] سورۂ ہود اور سورۂ حجر میں اس کی تفصیل یہ بیان ہوئی ہے کہ جو فرشتے قوم لوطؑ پر عذاب نازل کرنے کے لیے بھیجے گئے تھے وہ پہلے حضرت ابراہیمؑ کے پاس حاضر ہوئے اور انہوں نے آنجناب کو حضرت اسحاقؑ کی اور ان کے بعد حضرت یعقوبؑ کی پیدائش کی بشارت دی، پھر یہ بتایا کہ ہمیں قومِ لوطؑ کو تباہ کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔

[54] "اِس بستی" کا اشارہ قومِ لوط کے علاقے کی طرف ہے۔ حضرت ابراہیم اُس وقت فلسطین کے شہر حبرون (موجودہ الخلیل) میں رہتے تھے۔ اس شہر کے ٹھیک مشرق میں چند میل کے فاصلے پر بحیرۂ مردار (DEAD SEA) کا وہ حصہ واقع ہے جہاں پہلے قومِ لوط آباد تھی اور اب جس پر بحیرہ کا پانی پھیلا ہوا ہے۔ یہ علاقہ نشیب میں واقع ہے اور حبرون کی بلند پہاڑیوں پر سے صاف نظر آتا ہے۔ اسی لیے فرشتوں نے اس کی طرف اشارہ کرکے حضرت ابراہیمؑ سے عرض کیا کہ "ہم اس بستی کو ہلاک کرنے والے ہیں۔"

جانتے ہیں کہ وہاں کون کون ہے۔ ہم اسے ؛ اور اس کی بیوی کے سوا اس کے باقی سب گھر والوں کو بچا لیں گے۔ اس کی بیوی پیچھے رہ جانے والوں میں تھی ۵۶ ۔

۵۵ سورۂ ہود میں اس قصے کا ابتدائی حصہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ سب سے پہلے تو حضرت ابراہیمؑ فرشتوں کو انسانی شکل میں دیکھ کر ہی گھبرا گئے، کیونکہ اس شکل میں فرشتوں کا آنا کسی خطرناک مہم کا پیش خیمہ ہوا کرتا ہے۔ پھر جب انہوں نے آپ کو بشارت دی اور آپ کی گھبراہٹ دور ہو گئی اور آپ کو معلوم ہوا کہ یہ مہم قومِ لوطؑ کی طرف جا رہی ہے تو آپ اس قوم کے لیے بڑے اصرار کے ساتھ رحم کی درخواست کرنے لگے (فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرَاهِيمَ الرَّوْعُ وَجَاءَتْهُ الْبُشْرَىٰ يُجَادِلُنَا فِي قَوْمِ لُوطٍ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُنِيبٌ)۔ مگر یہ درخواست قبول نہ ہوئی اور فرمایا گیا کہ اس معاملہ میں اب کچھ نہ کہو، تمہارے رب کا فیصلہ ہو چکا ہے اور یہ عذاب اب ٹلنے والا نہیں ہے (يَا إِبْرَاهِيمُ أَعْرِضْ عَنْ هَٰذَا إِنَّهُ قَدْ جَاءَ أَمْرُ رَبِّكَ وَإِنَّهُمْ آتِيهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُودٍ) اس جواب سے جب حضرت ابراہیمؑ کو یہ امید باقی نہ رہی کہ قومِ لوطؑ کی مہلت میں کوئی اضافہ ہو سکے گا، تب انہیں حضرت لوطؑ کی فکر لاحق ہوئی اور انہوں نے وہ بات عرض کی جو یہاں نقل کی گئی ہے کہ "وہاں تو لوطؑ موجود ہے"۔ یعنی یہ عذاب اگر لوطؑ کی موجودگی میں نازل ہوا تو وہ اور ان کے اہل و عیال اس سے کیسے محفوظ رہیں گے۔

۵۶ اس عورت کے متعلق سورۂ تحریم (آیت ۱۰) میں بتایا گیا ہے کہ یہ حضرت لوطؑ کی وفادار نہ تھی۔ اسی وجہ سے اس کے حق میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ وہ بھی ایک نبی کی بیوی ہونے کے باوجود، عذاب میں مبتلا کر دی جائے۔ اغلب یہ ہے کہ حضرت لوطؑ ہجرت کے بعد جب اردن کے علاقے میں آکر آباد ہوئے ہوں گے تو انہوں نے اسی قوم میں شادی کر لی ہو گی لیکن ان کی صحبت میں ایک عمر گزار دینے کے بعد بھی یہ عورت ایمان نہ لائی اور اس کی ہمدردیاں اور دلچسپیاں اپنی قوم ہی کے ساتھ وابستہ رہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں رشتہ داریاں اور برادریاں کوئی چیز نہیں ہیں، ہر شخص کے ساتھ معاملہ اس کے اپنے ایمان و اخلاق کی بنیاد پر ہوتا ہے، اس لیے پیغمبر کی بیوی ہونا اس کے لیے کچھ بھی نافع نہ ہو سکا اور اس کا

پھر جب ہمارے فرستادے لُوطؑ کے پاس پہنچے تو ان کی آمد پر وہ سخت پریشان اور دل تنگ ہوا[۵۷]۔ انہوں نے کہا "نہ ڈرو اور نہ رنج کرو[۵۸]۔ ہم تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو بچالیں گے، سوائے تمہاری بیوی کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے۔ ہم اس بستی

انجام اپنے شوہر کے ساتھ ہونے کے بجائے اپنی اُس قوم کے ساتھ ہوا جس کے ساتھ اس نے اپنا دین و اخلاق وابستہ کر رکھا تھا۔

[۵۷] اس پریشانی اور دل تنگی کی وجہ یہ تھی کہ فرشتے بہت خوب صورت نوخیز لڑکوں کی شکل میں آتے تھے۔ حضرت لوطؑ اپنی قوم کے اخلاق سے واقف تھے، اس لیے ان کے آتے ہی وہ پریشان ہو گئے کہ میں اپنے ان مہمانوں کو ٹھیراؤں تو اس بدکردار قوم سے ان کو بچانا مشکل ہے، اور نہ ٹھیراؤں تو یہ بڑی بے مروتی ہے جسے شرافت گوارا نہیں کرتی، مزید برآں یہ اندیشہ بھی ہے کہ اگر میں ان مسافروں کو اپنی پناہ میں نہ لونگا تو رات انہیں کہیں اور گزارنی پڑیگی اور اس کے معنی یہ ہونگے کہ گویا میں نے خود انہیں بھیڑیوں کے حوالہ کیا۔ اس کے بعد کا قصہ یہاں بیان نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیلات سورۂ ہود، الحجر اور القمر میں بیان ہوئی ہیں کہ ان لڑکوں کی آمد کی خبر سُن کر شہر کے بہت سے لوگ حضرت لوطؑ کے مکان پر ہجوم کر کے آگئے اور اصرار کرنے لگے کہ وہ اپنے ان مہمانوں کو بدکاری کے لیے ان کے حوالے کر دیں۔

[۵۸] یعنی ہمارے معاملہ میں نہ اس بات سے ڈرو کہ یہ لوگ ہمارا کچھ بگاڑ سکیں گے اور نہ اس بات کے لیے فکر مند ہو کہ ہمیں ان سے کیسے بچایا جائے۔ یہی موقع تھا جب فرشتوں نے حضرت لوطؑ پر یہ راز فاش کیا کہ وہ انسان نہیں بلکہ فرشتے ہیں جنہیں اس قوم پر عذاب نازل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ سورۂ ہود میں اس کی تصریح ہے کہ جب لوگ حضرت لوطؑ کے گھر میں گھسے چلے آ رہے تھے اور آپ نے محسوس کیا کہ اب آپ کسی طرح بھی اپنے مہمانوں کو ان سے نہیں بچا سکتے تو آپ پریشان ہو کر چیخ اٹھے کہ لَوْ اَنَّ لِیْ بِکُمْ قُوَّۃً اَوْ اٰوِیْٓ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ، "کاش میرے پاس تمہیں ٹھیک کر دینے کی طاقت ہوتی یا کسی زور آور کی حمایت میں جا سکتا"۔ اس وقت فرشتوں نے کہا یٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّکَ لَنْ یَّصِلُوْٓا اِلَیْکَ "اے لوطؑ، ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں، یہ آپ کے مہمانوں تک ہرگز نہیں پہنچ سکتے"۔

کے لوگوں پر آسمان سے عذاب نازل کرنے والے ہیں اُس فسق کی بدولت جو یہ کرتے رہے ہیں۔" اور ہم نے اُس بستی کی ایک کھلی نشانی چھوڑ دی ہے[۵۹] ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں[۶۰]۔

اور مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا[۶۱]۔ اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو اور روزِ آخر کے امیدوار رہو[۶۲] اور زمین میں مفسد بن کر زیادتیاں نہ کرتے پھرو۔" مگر انہوں نے اسے جھٹلا دیا[۶۳]۔ آخر کار ایک سخت زلزلے

۵۹۔ اس کھلی نشانی سے مراد ہے بحیرۂ مردار جسے بحر لوط بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر کفار مکہ کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ اس ظالم قوم پر اس کے کرتوتوں کی بدولت جو عذاب آیا تھا اس کی ایک نشانی آج بھی شاہراہ عام پر موجود ہے جسے تم شام کی طرف اپنے تجارتی سفروں میں جاتے ہوئے شب و روز دیکھتے ہو۔ وَاِنَّھَا لَبِسَبِیْلٍ مُّقِیْمٍ (الحجر) اور وَاِنَّکُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَیْھِمْ مُّصْبِحِیْنَ وَبِالَّیْلِ (الصافات)۔

موجودہ زمانے میں یہ بات قریب قریب یقین کے ساتھ تسلیم کی جارہی ہے کہ بحیرۂ مردار کا جنوبی حصہ ایک ہولناک زلزلہ کی وجہ سے زمین دھنس جانے کی بدولت وجود میں آیا ہے اور اسی دھنسے ہوئے حصے میں قومِ لوط کا مرکزی شہر سدوم (SODOM) واقع تھا۔ اس حصے میں پانی کے نیچے کچھ ڈوبی ہوئی بستیوں کے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔ حال میں جدید آلاتِ غوطہ زنی کی مدد سے یہ کوشش شروع ہوئی ہے کہ کچھ لوگ نیچے جا کر ان آثار کی جستجو کریں لیکن ابھی تک ان کوششوں کے نتائج سامنے نہیں آئے ہیں۔

۶۰۔ عملِ قومِ لوط کی شرعی سزا کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۵۳۔۵۴

۶۱۔ تقابل کے لیے ملاحظہ ہو الاعراف رکوع ۱۱۔ ہود ۸۔ الشعراء ۱۰۔

۶۲۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ آخرت کے آنے کی توقع رکھو، یہ نہ سمجھو کہ جو کچھ ہے بس یہی دنیوی زندگی ہے اور کوئی دوسری زندگی نہیں ہے جس میں تمہیں اپنے اعمال کا حساب دینا

نے انہیں آلیا اور وہ اپنے گھر میں[۶۴] پڑے کے پڑے رہ گئے۔

اور عاد و ثمود کو ہم نے ہلاک کیا، تم وہ مقامات دیکھ چکے ہو جہاں وہ رہتے تھے[۶۵]۔ ان کے اعمال کو شیطان نے ان کے لیے خوشنما بنا دیا اور انہیں راہِ راست سے برگشتہ کر دیا حالانکہ وہ ہوش گوش رکھتے تھے[۶۶]۔ اور قارون و فرعون و ہامان کو ہم نے ہلاک کیا۔ موسیٰ ان کے پاس بیّنات لیکر آیا مگر انہوں نے زمین میں اپنی بڑائی

اور جزا و سزا پانا ہو۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ کام کرو جس سے تم آخرت میں انجام بہتر ہونے کی امید کر سکو۔

[۶۳] یعنی اس بات کو تسلیم نہ کیا کہ حضرت شعیب اللہ کے رسول ہیں، اور یہ احکام جو وہ دے رہے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں، اور ان کی خلاف ورزی کا نتیجہ انہیں عذابِ الٰہی کی شکل میں بھگتنا ہوگا۔

[۶۴] گھر سے مراد وہ پورا علاقہ ہے جس میں یہ قوم رہتی تھی۔ ظاہر ہے کہ جب ایک پوری قوم کا ذکر ہو رہا ہو تو اس کا گھر اس کا ملک ہی ہو سکتا ہے۔

[۶۵] عرب کے جن علاقوں میں یہ دونوں قومیں آباد تھیں ان سے عرب کا بچہ بچہ واقف تھا۔ جنوبی عرب کا پورا علاقہ جو اب احقاف، یمن اور حضر موت کے نام سے معروف ہے، قدیم زمانہ میں عاد کا مسکن تھا اور اہلِ عرب اس کو جانتے تھے۔ حجاز کے شمالی حصہ میں رابغ سے عقبہ تک اور مدینہ و خیبر سے تیما اور تبوک تک سارا علاقہ آج بھی ثمود کے آثار سے بھرا ہوا ہے اور نزولِ قرآن کے زمانہ میں یہ آثار موجودہ حالت سے کچھ زیادہ ہی نمایاں ہونگے۔

[۶۶] یعنی جاہل و نادان نہ تھے۔ اپنے اپنے وقت کے بڑے ترقی یافتہ لوگ تھے اور اپنی دنیا کے معاملات انجام دینے میں پوری ہوشیاری اور دانائی کا ثبوت دیتے تھے اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شیطان ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اور ان کی عقل سلب کر کے انہیں اپنے راستے پر کھینچ لے گیا۔ نہیں، انہوں نے خوب سوچ سمجھ کر آنکھوں دیکھتے شیطان کے پیش کیے ہوئے اس راستے

کا زعم کیا حالانکہ وہ سبقت لے جانے والے نہ تھے[67]۔ آخر کار ہر ایک کو ہم نے اس کے گناہ میں پکڑا، پھر ان میں سے کسی پر ہم نے پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیجی[68] اور کسی کو ایک زبردست دھماکے نے آلیا[69] اور کسی کو ہم نے زمین میں دھسا دیا[70]، اور کسی کو غرق کر دیا[71]۔ اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا، مگر وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے[72]۔

کو اختیار کیا جس میں انہیں بڑی لذتیں اور منفعتیں نظر آتی تھیں اور انبیاء کے پیش کیے ہوئے اس راستے کو چھوڑ دیا جو انہیں خشک اور بدمزہ اور اخلاقی پابندیوں کی وجہ سے تکلیف دہ نظر آتا تھا۔

[67] یعنی بھاگ کر اللہ کی گرفت سے بچ نکلنے والے نہ تھے۔ اللہ کی تدبیروں کو ناکام کر دینے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔

[68] یعنی عاد، جن پر مسلسل سات رات اور آٹھ دن تک سخت ہوا کا طوفان برپا رہا۔ (سورۃ الحاقہ، آیت ۷)

[69] یعنی ثمود۔

[70] یعنی قارون۔

[71] یعنی فرعون اور ہامان۔

[72] یہ تمام قصے جو یہاں تک سنائے گئے ہیں، ان کا روئے سخن دو طرف ہے۔ ایک طرف یہ اہلِ ایمان کو سنائے گئے ہیں تاکہ وہ پست ہمت اور دل شکستہ و مایوس نہ ہوں اور مشکلات و مصائب کے سخت سے سخت طوفان میں بھی صبر و استقلال کے ساتھ حق و صداقت کا علم بلند کیے رکھیں، اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھیں کہ آخر کار اس کی مدد ضرور آئیگی اور وہ ظالموں کو نیچا دکھائے گا اور کلمۂ حق کو سربلند کر دے گا۔ دوسری طرف یہ ان ظالموں کو بھی سنائے گئے ہیں جو اپنے نزدیک تحریکِ اسلامی کا بالکل قلع قمع کر دینے پر تلے ہوئے تھے۔ ان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ تم خدا کے حلم اور اس بردباری کا غلط مطلب لے رہے ہو۔ تم نے خدا کی خدائی کو اندھیر نگری سمجھ لیا ہے تمہیں اگر بغاوت و سرکشی اور ظلم و ستم اور بداعمالیوں پر ابھی تک نہیں پکڑا گیا ہے اور سنبھلنے کے لیے

جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے سرپرست بنا لیے ہیں ان کی مثال مکڑی جیسی ہے جو اپنا ایک گھر بناتی ہے اور سب گھروں سے زیادہ کمزور گھر مکڑی کا گھر ہی ہوتا ہے۔ کاش یہ لوگ علم رکھتے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر جس چیز کو بھی پکارتے ہیں اللہ

محض از راہ عنایت لمبی مہلت دی گئی ہے تو تم اپنی جگہ یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ یہاں کوئی انصاف کرنے والی طاقت سرے سے ہے ہی نہیں اور اس زمین پر جس کا جو کچھ جی چاہے بلا نہایت کیے جا سکتا ہے۔ یہ غلط فہمی آخر کار تمہیں جس انجام سے دوچار کر کے رہیگی وہ وہی انجام ہے جو تم سے پہلے قوم نوحؑ اور قوم لوطؑ اور قوم شعیبؑ دیکھ چکی ہے، جس سے عاد و ثمود دوچار ہو چکے ہیں، اور جسے قارون فرعون نے دیکھا ہے۔

۷۳؎ اوپر جتنی قوموں کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب شرک میں مبتلا تھیں اور اپنے معبودوں کے متعلق ان کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ ہمارے حامی و مددگار اور سرپرست (GUARDIANS.) ہیں، ہماری قسمتیں بنانے اور بگاڑنے کی قدرت رکھتے ہیں، ان کی پوجا پاٹ کر کے اور انہیں نذر و نیاز دے کر جب ہم ان کی سرپرستی حاصل کر لیں گے تو یہ ہمارے کام بنائیں گے اور ہم کو ہر طرح کی آفات سے محفوظ رکھیں گے۔ لیکن جیسا کہ اوپر کے تاریخی واقعات میں دکھایا گیا ہے، ان کے یہ تمام عقائد و اوہام اُس وقت بالکل بے بنیاد ثابت ہوئے جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی بربادی کا فیصلہ کر دیا گیا۔ اُس وقت کوئی دیوتا، کوئی اوتار، کوئی ولی، کوئی روح اور کوئی جن یا فرشتہ جسے وہ پوجتے تھے، ان کی مدد کو نہ آیا اور اپنی باطل توقعات کی ناکامی پر کفِ افسوس ملتے ہوئے وہ سب پیوندِ خاک ہو گئے۔ ان واقعات کو بیان کرنے کے بعد اب اللہ تعالیٰ مشرکین کو متنبہ کر رہا ہے کہ کائنات کے حقیقی مالک و فرمانروا کو چھوڑ کر بالکل بے اختیار بندوں اور سراسر خیالی معبودوں کے اعتماد پر جو توقعات کا گھروندا تم نے بنا رکھا ہے اس کی حقیقت مکڑی کے جالے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ جس طرح مکڑی کا جالا ایک انگلی کی چوٹ بھی برداشت نہیں کر سکتا اسی طرح تمہاری توقعات کا یہ گھروندا بھی خدا کی تدبیر سے پہلا تصادم ہوتے ہی پاش پاش ہو کر رہ جائے گا۔ یہ

اسے خوب جانتا ہے اور وہی زبردست اور حکیم ہے[۴۳]۔ یہ مثالیں ہم لوگوں کی فہمائش کے لیے دیتے ہیں مگر ان کو وہی لوگ سمجھتے ہیں جو علم رکھنے والے ہیں۔ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے[۴۴]، در حقیقت اس میں

محض جہالت کا کرشمہ ہے کہ تم ان اوہام کے چکر میں پڑے ہوئے ہو۔ حقیقت کا کچھ بھی علم تمہیں ہوتا تو تم ان بے بنیاد سہاروں پر اپنا نظامِ حیات کبھی تعمیر نہ کرتے۔ حقیقت بس یہ ہے کہ اختیارات کا مالک اس کائنات میں ایک رب العالمین کے سوا کوئی نہیں ہے اور اسی کا سہارا وہ سہارا ہے جس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (البقرہ۔ آیت ۲۵۶) "جو طاغوت سے کفر کرے اور اللہ پر ایمان لائے اُس نے وہ مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے اور اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔"

۴۳ یعنی اللہ کو ان سب چیزوں کی حقیقت خوب معلوم ہے جنہیں یہ لوگ معبود بنائے بیٹھے ہیں اور مدد کے لیے پکارتے ہیں۔ ان کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے۔ طاقت کا مالک صرف اللہ ہی ہے اور اسی کی تدبیر و حکمت اس کائنات کا نظام چلا رہی ہے۔

ایک دوسرا ترجمہ اس آیت کا یہ بھی ہو سکتا ہے: "اللہ خوب جانتا ہے کہ اسے چھوڑ کر جنہیں یہ لوگ پکارتے ہیں وہ کچھ بھی نہیں ہیں (یعنی بے حقیقت ہیں)، اور عزیز و حکیم بس وہی ہے۔"

۴۴ یعنی کائنات کا یہ نظام حق پر قائم ہے نہ کہ باطل پر۔ اس نظام پر جو شخص بھی صداقتِ ذہن کے ساتھ غور کرے گا اس پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ زمین و آسمان اوہام و تخیلات پر نہیں بلکہ حقیقت و واقعیت پر کھڑے ہیں۔ یہاں اس امر کا کوئی امکان نہیں ہے کہ ہر شخص اپنی جگہ جو کچھ بھی سمجھ بیٹھے اور اپنے وہم و گمان سے جو فلسفہ بھی گھڑ لے وہ ٹھیک بیٹھ جائے۔ یہاں تو صرف وہی چیز کامیاب ہو سکتی ہے اور قرار و ثبات پا سکتی ہے جو حقیقت اور واقعہ کے مطابق ہو۔ خلافِ واقعہ قیاسات اور مفروضات پر جو عمارت بھی کھڑی کی جائے گی وہ آخر کار حقیقت سے

ایک نشانی ہے اہلِ ایمان کے لیے[76] ع

(اے نبی) تلاوت کرو اس کتاب کی جو تمہاری طرف وحی کے ذریعہ سے بھیجی گئی ہے اور نماز قائم کرو[77]، یقیناً نماز فحش اور بُرے کاموں سے

سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گی۔ یہ نظامِ کائنات صاف شہادت دے رہا ہے کہ ایک خدا اس کا خالق ہے اور ایک ہی خدا اس کا مالک و مدبّر ہے۔ اس امرِ واقعی کے خلاف اگر کوئی شخص اس مفروضے پر کام کرتا ہے کہ اس دنیا کا کوئی خدا نہیں ہے، یا یہ فرض کرکے چلتا ہے کہ اس کے بہت سے خدا ہیں جو نذر و نیاز کا مال کھا کر اپنے عقیدتمندوں کو یہاں سب کچھ کرنے کی آزادی اور بخیریت رہنے کی ضمانت دے دیتے ہیں تو حقیقت اس کے ان مفروضات کی بدولت ذرہ برابر بھی تبدیل نہ ہوگی بلکہ وہ خود ہی کسی وقت ایک صدمۂ عظیم سے دوچار ہوگا۔

[76] یعنی زمین و آسمان کی تخلیق میں توحید کی صداقت اور شرک و دہریت کے بطلان پر ایک صاف شہادت موجود ہے، مگر اس شہادت کو صرف وہی لوگ پاتے ہیں جو انبیاء علیہم السلام کی پیش کی ہوئی تعلیمات کو مانتے ہیں۔ ان کا انکار کر دینے والوں کو سب کچھ دیکھنے پر بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

[77] خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، مگر دراصل مخاطب تمام اہلِ ایمان ہیں۔ ان پر جو ظلم و ستم اُس وقت توڑے جا رہے تھے، اور ایمان پر قائم رہنے میں جن شدید حوصلہ شکن مشکلات سے ان کو سابقہ پیش آ رہا تھا، ان کا مقابلہ کرنے کے لیے پچھلے چار رکوعوں میں صبر و ثبات اور توکل علی اللہ کی مسلسل تلقین کرنے کے بعد اب انہیں عملی تدبیر یہ بتائی جا رہی ہے کہ قرآن کی تلاوت کریں اور نماز قائم کریں، کیونکہ یہی دو چیزیں ایسی ہیں جو ایک مومن میں وہ مضبوط سیرت اور وہ زبردست صلاحیت پیدا کرتی ہیں جن سے وہ باطل کی بڑی سے بڑی طغیانیوں اور بدی کے سخت سے سخت طوفانوں کے مقابلہ میں نہ صرف کھڑا رہ سکتا ہے بلکہ ان کا

منہ پھیر سکتا ہے۔ لیکن تلاوتِ قرآن اور نماز سے یہ طاقت انسان کو اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جبکہ وہ قرآن کے محض الفاظ کی تلاوت پر اکتفا نہ کرے بلکہ اس کی تعلیم کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اپنی روح میں جذب کرتا چلا جائے۔ اور اس کی نماز صرف حرکات بدن تک محدود نہ رہے بلکہ اس کے قلب کا وظیفہ اور اس کے اخلاق و کردار کی قوتِ محرکہ بن جائے۔ نماز کے وصفِ مطلوب کو تو آگے کے فقرے میں قرآن خود بیان کر رہا ہے۔ رہی تلاوت تو اس کے متعلق یہ جان لینا چاہیے کہ جو تلاوت آدمی کے حلق سے تجاوز کر کے اس کے دل تک نہیں پہنچتی وہ اسے کفر کی طغیانیوں کے مقابلے کی طاقت تو درکنار، خود ایمان پر قائم رہنے کی طاقت بھی نہیں بخش سکتی، جیسا کہ حدیث میں ایک گروہ کے متعلق آیا ہے کہ یقرأون القرآن ولا یجاوز حناجرھم یمرقون من الدین مروق السھم من الرمیۃ "وہ قرآن پڑھیں گے مگر قرآن ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا، وہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر کمان سے نکل جاتا ہے" (بخاری، مسلم، موطا)۔ درحقیقت جس تلاوت کے بعد آدمی کے ذہن و فکر اور اخلاق و کردار میں کوئی تبدیلی نہ ہو بلکہ قرآن پڑھ کر بھی آدمی وہ سب کچھ کرتا رہے جس سے قرآن منع کرتا ہے وہ ایک مومن کی تلاوت ہے ہی نہیں۔ اس کے متعلق تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم صاف فرماتے ہیں کہ ما اٰمن بالقرآن من استحل محارمہ "قرآن پر ایمان نہیں لایا وہ شخص جس نے اس کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال کر لیا" (ترمذی بروایت صہیب رومی رضی اللہ عنہ)۔ ایسی تلاوت آدمی کے نفس کی اصلاح کرنے اور اس کی روح کو تقویت دینے کے بجائے اس کو اپنے خدا کے مقابلہ میں اور زیادہ ڈھیٹ اور اپنے ضمیر کے آگے اور زیادہ بے حیا بنا دیتی ہے اور اس کے اندر کیرکٹر نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہنے دیتی۔ کیونکہ جو شخص قرآن کو خدا کی کتاب مانے اور اسے پڑھ کر یہ معلوم بھی کرتا رہے کہ اس کے خدا نے اسے کیا ہدایات دی ہیں اور پھر اس کی ہدایات کی خلاف ورزی کرتا چلا جائے اس کا معاملہ تو اس مجرم کا سا ہے جو قانون سے ناواقفیت کی بنا پر نہیں بلکہ قانون سے خوب واقف ہونے کے بعد جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس پوزیشن کو

روکتی ہے[۸۱] اور اللہ کا ذکر اس سے بھی زیادہ بڑی چیز ہے[۸۲]۔ اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔

سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مختصر سے فقرے میں بہترین طریقے پر یوں واضح فرمایا ہے کہ القرآن حجۃ لك او علیك، "قرآن حجت ہے تیرے حق میں یا تیرے خلاف" (مسلم)۔ یعنی اگر تو قرآن کی ٹھیک ٹھیک پیروی کرتا ہے تو وہ تیرے حق میں حجت ہے۔ دنیا سے آخرت تک جہاں بھی تجھ سے باز پرس ہو، تو اپنی صفائی میں قرآن کو پیش کر سکتا ہے کہ میں نے جو کچھ کیا ہے اس کتاب کے مطابق کیا ہے۔ اگر تیرا عمل واقعی اس کے مطابق ہوا تو نہ دنیا میں کوئی قاضیٔ اسلام تجھے سزا دے سکے گا اور نہ آخرت میں داورِ محشر ہی کے ہاں اس پر تیری پکڑ ہو گی۔ لیکن اگر یہ کتاب تجھے پہنچ چکی ہو، اور تو نے اسے پڑھ کر یہ معلوم کر لیا ہو کہ تیرا رب تجھ سے کیا چاہتا ہے، کس چیز کا تجھے حکم دیتا ہے اور کس چیز سے تجھے منع کرتا ہے، اور پھر تو اس کے خلاف رویہ اختیار کرے تو یہ کتاب تیرے خلاف حجت ہے۔ یہ تیرے خدا کی عدالت میں تیرے خلاف فوجداری کا مقدمہ اور زیادہ مضبوط کر دے گی۔ اس کے بعد ناواقفیت کا عذر پیش کر کے بچ جانا یا ہلکی سزا پانا تیرے لیے ممکن نہ رہے گا۔

[۸۱] یہ نماز کے بہت سے اوصاف میں سے ایک وصف ہے جسے موقع و محل کی مناسبت سے یہاں نمایاں کر کے پیش کیا گیا ہے۔ مکہ کے اس ماحول میں جن شدید مزاحمتوں سے مسلمانوں کو سابقہ درپیش تھا ان کا مقابلہ کرنے کے لیے انہیں مادی طاقت سے بڑھ کر اخلاقی طاقت درکار تھی۔ اس اخلاقی طاقت کی پیدائش اور اس کے نشو و نما کے لیے پہلے دو تدبیروں کی نشان دہی کی گئی۔ ایک تلاوتِ قرآن۔ دوسرے اقامتِ صلوٰۃ۔ اس کے بعد اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ وہ ذریعہ ہے جس سے تم لوگ ان برائیوں سے پاک ہو سکتے ہو جن میں اسلام قبول کرنے سے پہلے تم خود مبتلا تھے اور جن میں تمہارے گرد و پیش اہلِ عرب کی اور عرب سے باہر کی جاہلی سوسائٹی اس وقت مبتلا ہے۔

غور کیا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ اس موقع پر نماز کے اس خاص فائدے کا ذکر کیوں کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اخلاقی برائیوں سے پاک ہونا اپنے اندر صرف اتنا ہی فائدہ نہیں

رکھتا کہ یہ بجائے خود ان لوگوں کے لیے دنیا و آخرت میں نافع ہے جنہیں یہ پاکیزگی حاصل ہو، بلکہ اس کا لازمی فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے ان کو ان سب لوگوں پر زبردست برتری حاصل ہو جاتی ہے جو طرح طرح کی اخلاقی برائیوں میں مبتلا ہوں اور جاہلیت کے اس ناپاک نظام کو، جو ان برائیوں کی پرورش کرتا ہے، برقرار رکھنے کے لیے ان پاکیزہ انسانوں کے مقابلہ میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہوں۔ فحشاء اور منکر کا اطلاق جن برائیوں پر ہوتا ہے انہیں انسان کی فطرت برا جانتی ہے اور ہمیشہ سے ہر قوم اور ہر معاشرے کے لوگ، خواہ وہ عملاً کیسے ہی بگڑے ہوتے ہوں، اصولاً ان کو برا ہی سمجھتے رہے ہیں۔ نزولِ قرآن کے وقت عرب کا معاشرہ بھی اس عام کلیے سے مستثنیٰ نہ تھا۔ اس معاشرے کے لوگ بھی اخلاق کی معروف خوبیوں اور برائیوں سے واقف تھے، بدی کے مقابلے میں نیکی کی قدر پہچانتے تھے، اور شاید ہی ان کے اندر کوئی ایسا شخص ہو جو برائی کو بھلائی سمجھتا ہو یا بھلائی کو بری نگاہ سے دیکھتا ہو۔ اس حالت میں اس بگڑے ہوئے معاشرے کے اندر کسی ایسی تحریک کا اٹھنا جس سے وابستہ ہوتے ہی خود اسی معاشرے کے افراد اخلاقی طور پر بدل جائیں اور اپنی سیرت و کردار میں اپنے ہم عصروں سے نمایاں طور پر بلند ہو جائیں، لامحالہ اپنا اثر کیے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ ممکن نہ تھا کہ عرب کے عام لوگ برائیوں کو مٹانے والی اور نیک اور پاکیزہ انسان بنانے والی اس تحریک کا اخلاقی وزن محسوس نہ کرتے اور اس کے مقابلے میں محض جاہلی تعصبات کے کھوکھلے نعروں کی بنا پر ان لوگوں کا ساتھ دیئے چلے جاتے جو خود اخلاقی برائیوں میں مبتلا تھے اور جاہلیت کے اس نظام کو قائم رکھنے کے لیے لڑ رہے تھے جو ان برائیوں کو صدیوں سے پرورش کر رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس موقع پر مسلمانوں کو مادی وسائل اور طاقتیں فراہم کرنے کے بجائے نماز قائم کرنے کی تلقین کی تاکہ یہ مٹھی بھر انسان اخلاق کی وہ طاقت اپنے اندر پیدا کر لیں جو لوگوں کے دل جیت لے اور تیر و تفنگ کے بغیر دشمنوں کو شکست دیدے۔

نماز کی یہ خوبی جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے، اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک اس کا وصفِ لازم ہے، یعنی یہ کہ وہ فحشاء اور منکر سے روکتی ہے، اور دوسرا اس کا وصفِ مطلوب ہے،

یعنی یہ کہ اس کا پڑھنے والا واقعی فحشاء اور منکر سے رُک جائے۔ جہاں تک روکنے کا تعلق ہے نماز لازمًا یہ کام کرتی ہے۔ جو شخص بھی نماز کی نوعیت پر ذرا سا غور کرے گا وہ تسلیم کرے گا کہ انسان کو برائیوں سے روکنے کے لیے جتنے بریک بھی لگانے ممکن ہیں ان میں سب سے زیادہ کارگر بریک نماز ہی ہو سکتی ہے۔ آخر اس سے بڑھ کر مؤثر مانع اور کیا ہو سکتا ہے کہ آدمی کو ہر روز دن میں پانچ وقت خدا کی یاد کے لیے بلایا جائے اور اس کے ذہن میں یہ بات تازہ کی جائے کہ تو اس دنیا میں آزاد و خود مختار نہیں ہے بلکہ ایک خدا کا بندہ ہے، اور تیرا خدا وہ ہے جو تیرے کھلے اور چھپے تمام اعمال سے، حتیٰ کہ تیرے دل کے ارادوں اور نیتوں تک سے واقف ہے، اور ایک وقت ضرور ایسا آنا ہے جب تجھے اس خدا کے سامنے پیش ہو کر اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہو گی۔ پھر اس یاد دہانی پر بھی اکتفا نہ کی جائے بلکہ آدمی کو عملاً ہر نماز کے وقت اس بات کی مشق کرائی جاتی رہے کہ وہ چھپ کر بھی اپنے خدا کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہ کرے۔ نماز کے لیے اٹھنے کے وقت سے لیکر نماز ختم کرنے تک مسلسل آدمی کو وہ کام کرنے پڑتے ہیں جن میں اس کے اور خدا کے سوا کوئی تیسری ہستی یہ جاننے والی نہیں ہوتی کہ اس شخص نے خدا کے قانون کی پابندی کی ہے یا اسے توڑ دیا ہے۔ مثلاً اگر آدمی کا وضو ساقط ہو چکا ہو اور وہ نماز پڑھنے کھڑا ہو جائے تو اس کے اور خدا کے سوا آخر کسے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ وضو سے نہیں ہے۔ اگر آدمی نماز کی نیت ہی نہ کرے اور بظاہر رکوع و سجود اور قیام و قعود کرتے ہوئے اذکارِ نماز پڑھنے کے بجائے خاموشی کے ساتھ غزلیں پڑھتا رہے تو اس کے اور خدا کے سوا کس پر یہ راز فاش ہو سکتا ہے کہ اس نے دراصل نماز نہیں پڑھی ہے۔ اس کے باوجود جب آدمی جسم اور لباس کی طہارت سے لیکر نماز کے ارکان اور اذکار تک قانونِ خداوندی کی تمام شرائط کے مطابق ہر روز پانچ وقت نماز ادا کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نماز کے ذریعہ سے روزانہ کئی کئی بار اس کے ضمیر میں زندگی پیدا کی جا رہی ہے، اس میں ذمہ داری کا احساس بیدار کیا جا رہا ہے، اسے فرض شناس انسان بنایا جا رہا ہے، اور اس کو عملاً اس بات کی مشق کرائی جا رہی ہے کہ وہ خود اپنے جذبۂ اطاعت کے زیر اثر خفیہ اور علانیہ ہر حال میں اس قانون

کی پابندی کرے جس پر وہ ایمان لایا ہے، خواہ خارج میں اس سے پابندی کرانے والی کوئی طاقت موجود ہو یا نہ ہو اور خواہ دنیا کے لوگوں کو اس کے عمل کا حال معلوم ہو یا نہ ہو۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ ماننے کے سوا چارہ نہیں ہے کہ نماز صرف یہی نہیں کہ آدمی کو فحشاء و منکر سے روکتی ہے بلکہ درحقیقت دنیا میں کوئی دوسرا طریق تربیت ایسا نہیں ہے جو انسان کو برائیوں سے روکنے کے معاملہ میں اس درجہ مؤثر ہو۔ اب رہا یہ سوال کہ آدمی نماز کی پابندی اختیار کرنے کے بعد عملاً بھی برائیوں سے رکتا ہے یا نہیں، تو اس کا انحصار خود اس آدمی پر ہے جو اصلاحِ نفس کی یہ تربیت لے رہا ہو۔ وہ اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے تو نماز کے اصلاحی اثرات اس پر مترتب ہوں گے، ورنہ ظاہر ہے کہ دنیا کی کوئی تدبیر اصلاح بھی اس شخص پر کارگر نہیں ہو سکتی جو اس کا اثر قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہو یا جان بوجھ کر اس کی تاثیر کو دفع کرتا رہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے غذا کی لازمی خاصیت بدن کا تغذیہ اور نشو و نما ہے، لیکن یہ فائدہ اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جبکہ آدمی اسے جزوِ بدن بننے دے۔ اگر کوئی شخص ہر کھانے کے بعد فوراً ہی قے کر کے ساری غذا باہر نکالتا چلا جائے تو اس طرح کا کھانا اس کے لیے کچھ بھی نافع نہیں ہو سکتا۔ جس طرح ایسے شخص کی نظیر سامنے لا کر آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ غذا موجبِ تغذیۂ بدن نہیں ہے کیونکہ فلاں شخص کھانا کھانے کے باوجود سوکھتا چلا جا رہا ہے، اسی طرح بدعمل نمازی کی مثال پیش کر کے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ نماز برائیوں سے روکنے والی نہیں ہے کیونکہ فلاں شخص نماز پڑھنے کے باوجود بدعمل ہے۔ ایسے نمازی کے متعلق تو یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ وہ درحقیقت نماز نہیں پڑھتا جیسے کھانا کھا کر قے کر دینے والے کے متعلق یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ وہ درحقیقت کھانا نہیں کھاتا۔

ٹھیک یہی بات ہے جو متعدد احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور بعض اکابر صحابہ و تابعین سے مروی ہوئی ہے۔ عمران بن حصین کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا من لم تنھہ صلاتہ عن الفحشاء والمنکر فلا صلاۃ لہ "جسے اس کی نماز نے فحش اور بُرے کاموں سے نہ روکا اس کی نماز نماز نہیں ہے" (ابن ابی حاتم)۔ ابن عباس حضورؐ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں: من لم تنھہ صلوتہ

عن الفحشاء والمنکر لم یزدد بہا من اللہ الا بعداً" جس کی نماز نے اسے فحش اور برے کاموں سے نہ روکا اس کو اس کی نماز نے اللہ سے اور زیادہ دُور کر دیا" (ابن ابی حاتم، طبرانی)۔ یہی مضمون جناب حسن بصری نے بھی حضور سے مرسلاً روایت کیا ہے (ابن جریر، بیہقی)۔ ابن مسعود سے حضور کا یہ ارشاد مروی ہے لاصلوٰۃ لمن لم یطع الصلوٰۃ وطاعۃ الصلوٰۃ ان تنہی عن الفحشاء والمنکر" اس شخص کی کوئی نماز نہیں ہے جس نے نماز کی اطاعت نہ کی، اور نماز کی اطاعت یہ ہے کہ آدمی فحشاء و منکر سے رک جائے" (ابن جریر، ابن ابی حاتم)۔ اسی مضمون کے متعدد اقوال حضرات عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس، حسن بصری، قتادہ اور اعمش وغیرہم سے منقول ہیں۔ امام جعفر صادق فرماتے ہیں، جو شخص یہ معلوم کرنا چاہے کہ اس کی نماز قبول ہوئی ہے یا نہیں اسے دیکھنا چاہیے کہ اس کی نماز نے اسے فحشاء اور منکر سے کہاں تک باز رکھا۔ اگر نماز کے روکنے سے وہ برائیاں کرنے سے رک گیا ہے تو اس کی نماز قبول ہوئی ہے (روح المعانی)۔

۷۹؎ اس کے کئی معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ کا ذکر (یعنی نماز) اس سے بزرگ تر ہے۔ اس کی تاثیر صرف سلبی ہی نہیں ہے کہ برائیوں سے روکے، بلکہ اس سے بڑھ کر وہ نیکیوں پر ابھارنے والی اور سبقت الی الخیرات پر آمادہ کرنے والی چیز ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی یاد بجائے خود بہت بڑی چیز ہے۔ خیر الاعمال ہے۔ انسان کا کوئی عمل اس سے افضل نہیں ہے۔ تیسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا تمہیں یاد کرنا تمہارے اس کو یاد کرنے سے زیادہ بڑی چیز ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ (البقرہ۔ آیت ۱۵۲) "تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد کروں گا"۔ پس جب بندہ نماز میں اللہ کو یاد کرے گا تو لامحالہ اللہ بھی اس کو یاد کرے گا۔ اور یہ فضیلت کہ اللہ کسی بندے کو یاد کرے، اس سے بزرگ تر ہے کہ بندہ اللہ کو یاد کرے۔ ان تین مطالب کے علاوہ ایک اور لطیف مطلب یہ بھی ہے جسے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی اہلیہ محترمہ نے بیان کیا ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی یاد نماز تک محدود نہیں بلکہ اس کا دائرہ اس سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ جب آدمی روزہ رکھتا ہے، یا زکوٰۃ دیتا ہے، یا کوئی نیک کام کرتا ہے تو لامحالہ اللہ کو یاد ہی کرتا ہے، تبھی تو اس سے وہ عمل نیک صادر ہوتا ہے۔ اسی طرح جب آدمی کسی برائی کے مواقع سامنے آنے پر اس سے پرہیز کرتا ہے تو یہ بھی اللہ کی یاد ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس لیے یاد الٰہی ایک مومن کی پوری زندگی پر حاوی ہوتی ہے۔

ارض القرآن کا سفر

(از محمد عاصم)

(۴)

ریاض یہ وادی حنیفہ کے قریب سعودی حکومت کا پایۂ تخت ہے۔ یہ نجد کے جس علاقہ میں واقع ہے اسے عارض کہا جاتا ہے، جو قبیلہ بنوتمیم کا قدیم مسکن رہا ہے۔ ۱۸۱۸ء سے پہلے ریاض عارض کے دوسرے قصبوں کی طرح ایک معمولی قصبہ تھا، لیکن ۱۸۱۸ء میں درعیہ کی تباہی کے بعد جب آلِ سعود نے اسے اپنا پایۂ تخت بنا لیا، تو اسے پورے نجد میں خاص اہمیت حاصل ہو گئی۔ اس وقت سے آج تک یہی آل سعود کا پایۂ تخت چلا آ رہا ہے، اگرچہ ۱۸۹۶ء میں حائل کے امراء آل الرشید نے اس پر قبضہ کر کے وقتی طور پر آل سعود کی حکومت کا خاتمہ کر دیا تھا، لیکن اس کے چند ہی سال بعد ۱۹۰۲ء میں موجودہ فرمانروا شاہ سعود کے والد عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن نے اپنے مٹھی بھر ساتھیوں کی مدد سے اس پر دوبارہ قبضہ کر لیا تھا۔ یہ شہر شروع سے اپنی سرسبزی اور باغات کی وجہ سے مشہور رہا ہے اور اسی وجہ سے اس کا نام ریاض (جمع روضہ) ہے۔

۱۸ اور ۱۹ نومبر کی درمیانی شب ہم ریاض پہنچ گئے۔ رات کے بارہ بج چکے تھے، ہم نے سوچا کہ ہم یہاں بالکل اجنبی ہیں اور کسی مناسب ہوٹل کا ہمیں علم نہیں ہے اس لیے پہلے دارالضیافہ جا کر دیکھیں، اگر وہاں کوئی ذمہ دار آدمی مل گیا تو خیر، ورنہ قریب میں جو ہوٹل بھی مل جائے اسی میں قیام کر لیا جائے۔ چنانچہ مولانا سٹیشن پر ٹھہرے رہے اور میں اور چودھری صاحب ٹیکسی لے کر دارالضیافہ روانہ ہوئے۔ راستے میں ریاض کی بہت سی سڑکوں اور بازاروں سے ہمارا گزر ہوا، جو نہایت شاندار اور جدید طرز پر بنے ہوئے تھے اور ان پر بجلی کی روشنی کا عمدہ انتظام تھا۔ دکانیں اگرچہ بند تھیں، لیکن اندازہ ہوا کہ گزشتہ چند سال کے اندر ریاض بہت ہی وسیع اور جدید

طرز کا شہر بن چکا ہے۔ ۱۹۴۹ء میں جب مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کے ساتھ میں پہلی مرتبہ ریاض آیا تھا تو یہ ایک معمولی قسم کا قصبہ تھا، ہمارے ہاں کے دیہات سے بھی گیا گذرا۔ نہ یہاں کوئی بازار تھا اور نہ کوئی پختہ سڑک سوائے ایک سڑک کے جو شہر سے ہوائی اڈہ تک جاتی تھی، بجلی تھی لیکن بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد تک محدود۔ تنگ و تاریک قسم کی گلیوں میں معمولی قسم کی دکانیں تھیں اور ان ہی کو بازار کہا جاتا تھا۔ نہ یہاں کوئی ہوٹل اور نہ کرائے کی کوئی سواری مل سکتی تھی۔ تمام مکانات حتیٰ کہ بادشاہ اور امراء کے محلات بھی کچے تھے۔ البتہ نئی تعمیرات کا آغاز ہو چکا تھا جس کی ابتدا شاہی خاندان کے محلات کی تعمیر سے ہو رہی تھی۔ لیکن اب تو سارا نقشہ ہی بدلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ دار الضیافہ بھی اگرچہ (جیسا کہ میرا خیال ہے) وہی تھا جس میں میں اور مولانا مسعود عالم صاحب ٹھہرے تھے، لیکن بالکل بدلا ہوا۔ پہلے بالکل کچا تھا، اور اب پختہ اور نہایت شاندار۔ ہم نے دروازہ کھٹکھٹایا تو ایک ملازم باہر آیا۔ اس نے بتایا کہ مدیر الضیافہ شیخ ابن جُمیح اس وقت موجود نہیں ہیں، آپ لوگ یا تو صبح آئیں یا اسی وقت ان کے مکان پر ان سے ملاقات کریں۔ رات کے وقت ہم نے ان کے ہاں جانا مناسب نہ سمجھا اور ٹیکسی والے سے کہا کہ کسی قریب کے ہوٹل میں ہمیں لے جائے۔ وہ ہمیں شارع البطحاء پر ایک ہوٹل "فندق السلام" میں لے گیا۔ معمولی قسم کا ہوٹل تھا، لیکن کرایہ بہت زیادہ، یعنی دس ریال (۱۳ روپے) فی کس یومیہ۔ اس وقت ہم نے اسی کو غنیمت جانا اور وہیں اپنا سامان اتار لیا۔ بعد میں چودھری صاحب مولانا کو بھی یہیں لے آئے۔

ریاض کی شان و شوکت صبح ناشتہ کے بعد فکر ہوئی کہ یہاں ریاض میں جن لوگوں سے ہمیں ملنا ہے، ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ کیونکر شروع کیا جائے؟ استاد عبدالحکیم عابدین کے متعلق معلوم تھا کہ وہ ایک ہوٹل "زہرۃ الشرق" میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ خُبر کی ملاقات کے دوران انہوں نے ہمیں اپنے کمرے کا نمبر بھی دے دیا تھا۔ سوچا کہ پہلے ان سے ملا جائے اور پھر کوئی پروگرام طے کیا جائے۔ مولانا ہوٹل میں رہے۔ میں اور چودھری صاحب ایک

ٹیکسی لے کر "زہرۃ الشرق" گئے، جو ریاض کا سب سے شاندار ہوٹل ہے اور اس کی سب سے شاندار سڑک "شارع المطار" (ہوائی اڈہ کی سڑک) پر واقع ہے۔ اس کے تمام کمرے گرمی اور سردی دونوں میں ایرکنڈیشنڈ ہیں اور اس میں ایک دن کے قیام کا کرایہ ۶۰ ریال (۸۰ روپے) فی کس ہے۔ شان و شوکت اور خوبصورتی کے لحاظ سے اس کے پائے کا ہوٹل کم از کم میرے اندازے کے مطابق نہ پاکستان میں ہے اور نہ مصر، شام اور عراق میں شارع المطار کی خوبصورتی اور شان و شوکت کے بھی کیا کہنے۔ ہمارے ہاں کراچی، لاہور کی کوئی سڑک بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کے دونوں کناروں پر زراعت، مالیات، تعلیم، مواصلات اور دوسری وزارتوں کے جدا جدا شاندار دفاتر واقع ہیں جن میں سے ہر ایک کی تعمیر پر لاکھوں روپیہ صرف آیا ہے۔ یہ سب جدید ترین مغربی طرز پر بنے ہوئے ہیں اور ہر ایک کا طرز تعمیر نرالا ہے۔ گزشتہ چند سال کے اندر سعودی حکومت کی تمام وزارتوں کے دفاتر ریاض منتقل ہو گئے ہیں۔ صرف وزارتِ خارجہ اور وزارتِ داخلہ ابھی تک علی الترتیب جدہ اور مکہ معظمہ میں ہیں اور شاید آئندہ کئی سال تک وہیں رہیں۔

استاذ عبدالحکیم عابدین کے متعلق دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ ایک دوسرے ہوٹل "فندق الیمامہ" میں منتقل ہو گئے ہیں۔ یہ ہوٹل بھی شارع المطار ہی پر واقع ہے اور اپنی شان و شوکت اور انتظامات میں "زہرۃ الشرق" سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ وہاں استاذ موصوف ہمیں مل گئے۔ انہیں جب یہ معلوم ہوا کہ ہم ایک معمولی ہوٹل میں ٹھہر گئے ہیں تو انہوں نے چاہا کہ ہمیں شاہی مہمان بنوانے کی کوشش کریں لیکن خواہ مخواہ کوشش کر کے مہمان بننا ہمیں پسند نہ تھا۔ استاذ عابدین کو ساتھ لیکر ہم مولانا کے پاس "فندق السلام" آئے اور وہاں یہی طے ہوا کہ جتنے دن بھی ریاض میں ٹھہرنا ہو ہم اسی ہوٹل میں ٹھہرے رہیں گے۔ معلوم ہوا کہ ریاض میں یا تو اسی طرح کے چند معمولی ہوٹل ہیں یا پھر "زہرۃ الشرق" اور "الیمامہ" جیسے دو شاندار ہوٹل جن میں ٹھہرنا بہرحال ہماری بساط سے باہر تھا۔ استاذ عبدالحکیم عابدین بار بار شرمندگی محسوس کرتے رہے اور اپنے

فندق الیمامہ میں قیام پر معذرت کرتے رہے کہ اس ہوٹل میں میرا قیام اپنے مصارف پر نہیں ہے بلکہ میرا موکل جو اپنے مقدمہ کی پیروی کے لیے مجھے بیروت سے لایا ہے، خود بھی اسی ہوٹل میں ٹھہرا ہے اور مجھے بھی اپنے ساتھ وہیں ٹھہرا لیا ہے۔

اسی روز عصر کے قریب ہمارے مکہ معظمہ کے دوست عبداللہ بن کُلَیب تشریف لائے جو ان دنوں اپنے ایک ذاتی کام کے سلسلے میں ریاض آئے ہوئے تھے۔ استاذ عبدالحکیم عابدین سے انہیں ہماری آمد کی اطلاع ہوئی تو فوراً ملاقات کے لیے آگئے۔ ان کے ساتھ دو صاحب اور بھی تھے جن سے ہمارا تعارف پہلی مرتبہ ہوا۔ ایک شیخ مَنّاع القَطّان جو ریاض کے کلیتہ الشریعہ میں پروفیسر ہیں اور اصل میں مصر کے رہنے والے ہیں، لیکن اخوان سے تعلق ہونے کی وجہ سے مصر سے نکال دیئے گئے ہیں دوسرے احمد باحشوان جو حضر موت کے باشندے ہیں اور ریاض کے ایک ابتدائی مدرسہ میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ شیخ مناع القطان نے ہمیں اگلے روز اپنے ہاں ناشتہ کی دعوت دی جو ہم نے منظور کر لی۔

شیخ عبدالعزیز بن باز مغرب کے بعد نجد کے مشہور عالم شیخ عبدالعزیز بن باز چند اصحاب کے ساتھ تشریف لائے۔ استاذ عابدین سے انہیں ہماری ریاض میں آمد کی اطلاع ہو گئی تھی۔ شیخ عبدالعزیز گو پیدائشی نابینا ہیں اور زیادہ عمر کے بھی نہیں ہیں، لیکن ان کا شمار سعودی عرب کے چند بڑے علماء میں ہوتا ہے۔ اپنے اخلاص، علم، ذہانت، سادگی، استغناء، طالب علمانہ مزاج اور سب سے بڑھ کر حق گوئی میں جرأت کی وجہ سے وہ پوری مملکت میں نہایت مشہور و محبوب ہیں۔ ان کے پاس کوئی سرکاری عہدہ نہیں ہے۔ صرف کلیتہ الشریعہ میں پڑھاتے ہیں اور وہیں سے مشاہرہ پاتے ہیں۔ ان کی حق گوئی کا ایک واقعہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ ۱۹۴۹ء میں جب میں اور مولانا مسعود عالم صاحب ندوی مرحوم ریاض آئے تھے، تو ایک روز شام کے وقت ہم لوگ مفتی اکبر شیخ محمد بن ابراہیم کے مکان پر بیٹھے ہوئے تھے، آل الشیخ (شیخ محمد بن عبدالوہاب کے خاندان) کے علماء و مشائخ کے علاوہ شیخ عبدالعزیز بن باز بھی موجود تھے۔ ان دنوں پاکستان میں سعودی حکومت کے سفیر سید

عبدالحمید خطیب تھے۔ سب لوگ ان کی دینداری کی تعریف کر رہے تھے۔ شیخ عبدالعزیز بولے "سید عبدالحمید خطیب کی میں بھی عزت کرتا ہوں اور پاکستان میں ان کی سرگرمیوں کا حال سن کر بڑی خوشی ہوتی ہے مگر انہوں نے رمضان کے "امساکیہ" (نقشہ افطار و سحر) میں سلطان اور ولیعہد کی تصویر چھاپ کر برا کیا ہے۔ یہ چیز اچھی نہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آگے چل کر ان کی پرستش شروع ہو جائے گی۔"[۱] شیخ کی محبوبیت کا یہ حال ہے کہ ہم نے اپنے پورے سفر کے دوران سعودی مملکت کے اندر بھی اور اس سے باہر دوسرے عرب ملکوں میں بھی کوئی ایسا آدمی نہیں پایا جو ان کے علم، اخلاص اور حق گوئی کا قائل اور مداح نہ ہو۔ پاکستان کے سعودی سفیر نے ہمیں ان کے نام ایک دستی خط دیا تھا، اس لیے ہمارا خیال تھا کہ ان کے ہاں خود حاضر ہوں لیکن انہوں نے پیش قدمی فرمائی اور خود ہی ملاقات کے لیے تشریف لے آئے۔ دراصل عربوں کے ہاں مہمان کے استقبال اور تواضع کے جو اصول ہیں، ان میں "القادم یزار" (یعنی یہ کہ پہلے مہمان سے اس کی جائے قیام پر ملاقات کی جائے اور پھر اسے اپنے ہاں بلایا جائے) کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ شیخ عبدالعزیز بن باز کو اس سے پہلے مولانا اور ان کے کارناموں — ان لوگوں کے بقول "جہاد" — سے واقف تھے اور ان کی چند کتابیں بھی پڑھ چکے تھے لیکن دونوں کے درمیان کبھی ملاقات یا مراسلت کا سلسلہ نہ رہا تھا۔ سلام و دعا کے بعد بار بار مولانا سے خیریت دریافت فرماتے رہے۔

اہل نجد کی عادت ہے کہ وہ اپنے مہمان اور ملنے والے سے بار بار "کیف حالکم؟" کہتے ہیں اور "عساکم طیبین، عساکم بخیر" کے اس قدر پے در پے سوالات کرتے ہیں کہ ایک غیر عرب مہمان حیران رہ جاتا ہے۔ اس پر مزید یہ کہ بات بات پر وہ اپنے مخاطب کو دعائیں دیتے ہیں۔ ریاض میں "طال عمرک" (آپ کی عمر دراز ہو) تو ہر شخص کا تکیہ کلام ہے۔ ہر دعا کا ایک مخصوص جواب یہ لوگ آپس میں تو بڑی آسانی سے دے لیتے ہیں، لیکن مشکل ہم جیسے اجنبی لوگوں کو پیش آتی ہے۔ جواب نہ دیں تو یہ بڑی بدتہذیبی ہے اور جواب دیں تو ہر مرتبہ پہلے سے مختلف کیا جواب دیں؟

۱؎ یہاں ضمناً یہ بات بیان کر دینا شاید نامناسب نہ ہو کہ دوسرے عرب ممالک کے علماء تو اب تصویر کو حلال

(باقی صفحہ ۳۵۸ پر)

ہم نے شیخ کو سعودی سفیر کا خط دیا اور انہوں نے وہیں اسے اپنے ایک شاگرد سے پڑھوا کر سنا۔ اس کے بعد سفر کی غرض و غایت اور پروگرام کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ آخر میں شیخ نے مولانا سے دریافت فرمایا۔ "کیا آپ (شاہ کے چچا) امیر عبداللہ بن عبدالرحمٰن کے ہاں جانا پسند کریں گے؟" امیر عبداللہ بن عبدالرحمٰن کے متعلق شیخ نے بتایا کہ اس وقت یہ آل سعود (شاہی خاندان) کے سب سے بزرگ اور اقرب الی الدین آدمی ہیں۔ مولانا تیار ہو گئے اور اس کے بعد ہم سب شیخ ہی کی موٹر میں بیٹھ کر امیر عبداللہ کے قصر پہنچے۔ لیکن معلوم ہوا کہ امیر موجود نہیں ہیں۔ اس کے بعد ہم ان کے چھوٹے بھائی امیر مساعد بن عبدالرحمٰن (جو ان دنوں امیر فیصل کی عدم موجودگی میں قائم مقام وزیر اعظم تھے) سے ملنے کے لیے روانہ ہوئے۔

قدیم ریاض راستے میں اندازہ ہوا کہ اگرچہ ریاض بہت کچھ تبدیل ہو گیا ہے اور اس میں بڑی شاندار سڑکیں اور عمارتیں بن چکی ہیں، لیکن ابھی قدیم ریاض بھی اپنی کچی گلیوں اور عمارتوں کے ساتھ باقی ہے۔ لوگوں نے ہمیں بتایا کہ جو مکانات کچے ہیں، انہیں قصداً کچا رکھا گیا تھا کیونکہ یہاں کی آب و ہوا میں کچے مکانات ہی زیادہ مناسب ہیں۔ پختہ مکانات جب تک ایرکنڈیشنڈ نہ ہوں، ان میں گرمی اور سردی دونوں میں سخت تکلیف ہوتی ہے لیکن اب پرانے مکانات کو گرانے اور ان کی جگہ نئے پختہ مکانات بنانے کا سلسلہ جاری ہے اور امید ہے کہ آئندہ دس سال میں سارا شہر پختہ اور نئے طرز پر تعمیر ہو جائے گا۔ امیر مساعد کا مکان بھی قدیم ریاض کی ایک گلی میں واقع ہے اور اس پر کوئی جھنڈا یا علامتی نشان بھی نہیں ہے اور نہ ڈیوڑھی پر پولیس کا پہرہ ہے (دو چار سپاہی اندر کہیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵۷) سمجھتے ہیں، لیکن نجد کے علماء اس کی حرمت پر متفق ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس وقت سعودی عرب میں بھی علماء کی مرضی کے علی الرغم تصاویر کو رواج عام حاصل ہو گیا ہے اور دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ تاہم علماء کی رائے کا یہ اثر ضرور ہے کہ ہمیں ریاض کے کسی رئیس یا سرکاری افسر کے مکان میں اور کسی ہوٹل یا دوکان میں کوئی تصویر علانیہ دیواروں پر ٹنگی ہوئی نظر نہیں آئی۔ بازاروں میں کوئی اشتہاری بورڈ بھی تصویر کے ساتھ نہیں دیکھا۔

ہوں تو اور بات ہے)۔ اس لیے شیخ کا ڈرائیور ان کا مکان نہ پہچان سکا اور ہم ایک دوسری گلی میں ایک دوسرے امیر کے ہاں پہنچ گئے۔ ہمیں تو خیر کچھ پتہ ہی نہ تھا، لیکن شیخ عبدالعزیز اور استاذ عبدالحکیم عابدین کو وہاں پہنچتے ہی اندازہ ہو گیا کہ ہم غلط جگہ آ گئے ہیں۔ کچھ دیر وہاں بیٹھے، قہوہ اور چائے بھی پی، تاکہ ان پر یہ ظاہر نہ ہو کہ ہم غلطی سے ان کے ہاں آ گئے ہیں۔ وہاں سے نکلنے کے بعد استاذ عبدالحکیم عابدین نے ہمیں حقیقت حال سے مطلع کیا۔ اس کے بعد ہم امیر مساعد کے ہاں پہنچے، مگر وہ بھی موجود نہ تھے۔ پھر شیخ عبدالعزیز ہمیں اپنے مکان پر لے آتے، جو قدیم ریاض ہی کی ایک گلی میں واقع ہے۔ وہاں ان کے شاگردوں اور عقیدتمندوں کا حلقہ لگا ہوا تھا۔ مجلس نہایت سادہ اور زمین پر قالین کے فرش کی تھی۔ تمام حاضرین نے رسمی سلام و مصافحہ کے بعد اپنا اپنا تعارف کرایا۔ اور اپنے پاکستانی "سلفی بھائیوں" کا حال دریافت کرنے لگے۔ نجدی علماء اور ان کے متعلقین جب بھی کسی پاکستانی یا ہندوستانی مسلمان سے ملتے ہیں یہاں کے اہل حدیث حضرات کے متعلق ضرور سوال کرتے ہیں ہم نے مجمل الفاظ میں انہیں پاکستان کے اہلحدیث حضرات کی خیریت کی اطلاع دی۔ اس کے بعد مولانا نے شیخ کی خدمت میں اپنی چار عربی کتابیں رسالہ دینیات، اسلام کا نظام حیات، مسلمانوں کا ماضی و حال اور قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں پیش کیں۔

نجدی ضیافت یہ بتانا شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو کہ اس اثناء میں شیخ نے بخور (لوبان کا دھواں)، قہوہ اور چائے سے ہماری تواضع فرمائی تھی۔ اس سے پہلے ہم عربی تہذیب کے ان لوازم کی ترتیب، اہمیت اور آداب کو اچھی طرح نہیں جانتے تھے۔ آج کی خالص نجدی مجلس میں ان کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہوا۔ سب سے پہلے شیخ کا ایک ملازم مجمر (انگاردان جو لکڑی کا بنا ہوتا ہے اور اس کے اوپر سرخ روغن کر کے باریک باریک سنہری کیلیں لگی ہوتی ہیں اور اوپر کے حصے میں کوئلے رکھنے کی جگہ ہوتی ہے) لے کر شیخ کے پاس آیا۔ شیخ نے اپنی جیب سے لوبان کا ایک ٹکڑا نکال کر کوئلوں پر رکھا، جس سے دھواں اٹھنے لگا۔ پھر اس ملازم نے مجمر لے کر تمام شرکائے مجلس کے سامنے دو تین مرتبہ چکر لگایا۔ اپنے ہاتھوں سے چہروں اور کپڑوں پر دھواں لے رہے تھے۔ بعض لوگ تو مجمر اپنے ہاتھ

میں سے کر ایک دو منٹ تک اپنے رومال یا مِشْلَہ (عربی چغہ) کے اندر رکھتے اور پھر اسے لوٹا دیتے۔
ہمارے لیے یہ منظر بڑا ہی دلچسپ تھا۔ دوسروں کو دیکھ کر ہم بھی مجمر کے دھوئیں سے متمتع ہوئے۔
بخور کا یہ رواج عربوں کے ہاں بہت پرانا ہے اور اسے مہمان کی خاطر و مدارات کا اہم ترین جز
شمار کیا جاتا ہے۔ کتاب الاغانی اور ادب کی دوسری کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عباسی خلفاء کے
دربار میں بھی بخور کا اسی طرح دَور چلا کرتا تھا۔

پھر قہوہ کا دَور شروع ہوا، اور اس کی شکل یہ تھی کہ وہی ملازم اپنے ایک ہاتھ میں قہوہ کا ایک
لمبا سا برتن اور دوسرے ہاتھ میں قلمدان کی دواتوں جیسی چھوٹی چھوٹی چند پیالیاں لے کر نمودار ہوا۔
وہ باری باری ہر شخص کو ایک ایک پیالی دیتا اور اس میں قہوہ کے چند قطرے ڈال دیتا۔ ہر شخص
قہوہ کے یہ چند قطرے پی کر پیالی ملازم کے حوالے کر دیتا۔ اس طرح جب پورا چکر ختم ہو جاتا، تو
دوسرا چکر شروع ہوتا، اور جب تک کوئی شخص ایک خاص طریقہ سے اپنی پیالی ہلا کر واپس نہ کرتا
اس کی پیالی میں بار بار قہوہ ڈالنے کا سلسلہ جاری رہتا۔ اس کے بعد چائے (بلا دودھ) آئی اور
پھر قہوہ کا ایک اور دَور چلا۔ یہ کم سے کم ضیافت ہے جو ہر نجدی اپنے مہمان کے لیے لازماً کرتا
ہے۔ نجدی حضرات کا یہ قہوہ الائچی اور بُن (کنئی کے دانے کے برابر ایک سخت چیز جو یمن یا حبشہ
سے برآمد کی جاتی ہے) کُوٹ کر تیار کیا جاتا ہے اور اس قدر تلخ ہوتا ہے کہ واقعی اسے ہر
مرتبہ چند قطروں سے زیادہ نہیں پیا جا سکتا۔ معلوم نہیں عربوں کے ہاں قہوہ کا یہ رواج کب سے
ہوا، لیکن اب تو یہ لوگ اسے بڑے ہی مزے سے پیتے ہیں اور بعض تو اس کے اس قدر دلدادہ
ہوتے ہیں کہ جب تک صبح اُٹھ کر اس کی خدمت نہ کر لیں اور اس کے چند گھونٹ حلق سے نیچے
نہ اُتار لیں، اپنے اندر چستی محسوس نہیں کرتے۔ ایک مرتبہ ایک عرب کو علی الصباح قہوہ بنا کر پیتے
دیکھ کر مولانا فرمانے لگے کہ ہمارے ہاں حقہ پینے اور پان کھانے والوں کو "شرم" آنی چاہیے
کہ انہیں اپنے حقے اور پان سے اتنا بھی عشق نہیں ہے جتنا ان لوگوں کو اپنے قہوہ سے ہے

؎ اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

شاہ سعود کا قصر الناصریہ عشا کی نماز شیخ عبدالعزیز بن باز کے ہاں ادا کر کے ہم اپنے ہوٹل کی طرف واپس ہوئے۔ راستے میں شیخ کے ڈرائیور نے ہمیں ریاض دکھایا۔ پہلے اس نے ہمیں شارع المطار اور شارع الجامعہ (یونیورسٹی کی سڑک) کی سیر کرائی، جو بجلی کی روشنی میں بہت ہی شاندار اور خوبصورت نظر آرہی تھیں۔ معلوم ہوا ہے کہ گذشتہ چار سال میں سعودی حکومت نے ریاض کی سڑکوں پر جو رقم صرف کی ہے وہ تقریباً ۶۵۳،۳۷۱۶۸ روپے ہے۔ پھر وہ ہمیں شاہ سعود کے محل "الناصریہ" لے گیا، جس کی خوبصورتی اور شان و شوکت کو بیان کرنا کم از کم میرے جیسے کوتاہ قلم اور غیر ادیب آدمی کے لیے بڑا ہی مشکل ہے۔ کم از کم ایک میل لمبا اور نصف میل چوڑا باغ ہے اور اس کے وسط میں نہایت ہی شاندار محل۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس باغ کے اندر جانے اور محل کے ارد گرد گھومنے اور سیر کرنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ جو شخص چاہے اس کی سیر کر سکتا ہے۔ اس پر ہمیں اپنے ہاں کے حکامِ عالی مقام بڑے یاد آئے۔

اگلے دن (۲۰ نومبر) کو علی الصباح ریاض کے کلیۃ الشریعہ کے تین شامی طلبہ ہماری ملاقات کے لیے ہوٹل آئے۔ انہوں نے مولانا کی تمام عربی کتابیں پڑھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ یہاں کلیۃ الشریعہ میں ایسے طلبہ کی تعداد جنہوں نے مولانا کی تمام عربی کتابیں پڑھی ہوئی ہیں، بیس سے زائد ہے اور وہ نہ صرف یہ کہ خود یہ کتابیں پڑھتے ہیں بلکہ دمشق سے انہیں منگوا کر دوسرے طلبہ میں بھی پھیلاتے اور فروخت کرتے ہیں۔ یہ تینوں طلبہ دراصل ہمیں اپنے ایک اجتماع میں دعوت دینے کے لیے آئے تھے، جسے یہ لوگ اسی روز عصر کے بعد خاص طور پر مولانا سے ملاقات کے لیے اپنے کالج میں منعقد کر رہے تھے اور اس میں صرف وہی طلبہ شریک ہو رہے تھے جو پہلے سے مولانا سے متعارف اور ان کی کتابیں پڑھے ہوئے تھے۔

باپردہ عورتوں کا بازار ۹ بجے (صبح) ہم اپنے وعدے کے مطابق شیخ مناع القطان کے ہاں گئے۔ ان کا مکان سبزی منڈی کے پاس ہے۔ وہاں منڈی میں ہم نے دیکھا کہ عورتوں کا ایک بازار الگ لگا ہوا ہے، جس میں صرف عورتیں کپڑے، برتن، مرغیاں، انڈے اور دوسری

چیزیں فروخت کر رہی تھیں اور عورتیں ہی خریدار تھیں۔ ان میں کوئی ایک عورت بھی ہمیں بے پردہ اور بے نقاب نظر نہ آئی۔ نقاب کے باوجود یہ سب بآسانی خرید و فروخت کر رہی تھیں۔ یہی منظر ۱۹۴۹ء میں ہم نے کویت میں بھی دیکھا تھا۔ اسے دیکھ کر ہمیں ان لوگوں کی عقل پر حیرت ہوئی، جو کہتے ہیں کہ عورت پردہ کے ساتھ کوئی کام نہیں کر سکتی۔

عرب قومیت کا ثمرہ | ناشتہ کے بعد دیر تک شیخ مناع القطان سے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ وہ خاص طور پر عرب ممالک میں عرب قومیت کی تحریک سے سخت خطرے کا اظہار کرتے رہے۔ انہوں نے ایک مشہور عرب شاعر "القروی" کا قصیدہ ہمیں سنایا جس میں وہ کہتا ہے:

بلادك قدمها على كل ملة ومن اجلها افطر ومن اجلها صم

سلامٌ على كفر يوحد بيننا واهلا وسهلا بعدهٗ بجهنّم

فقد مزقت هذه المذاهب بيننا وقد حطمتنا بين ناب ومنسم

[اپنے وطن کو ہر دین و ملت پر مقدم رکھو۔ اسی کے لیے افطار کرو اور اسی کے لیے روزہ رکھو۔ سلام ہو اس کفر پر جو ہمارے درمیان اتحاد پیدا کر دے اس کے بعد اگر جہنم بھی نصیب ہو تو ہم اس کا خیر مقدم کریں گے۔ ان مذاہب نے تو ہمارے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا ہے اور اونٹ کے دانتوں اور کھروں کے درمیان ہمیں پیس ڈالا ہے۔]

یہ اشعار سنا کر انہوں نے کہا کہ عرب قومیت کی یہ تحریک ایک سیدھی سادی بے ضرر قسم کی قومی تحریک نہیں ہے بلکہ درپردہ یہ مسلمانوں کو ان کے دین سے برگشتہ کرنے اور الحاد و دہریت کی طرف دھکیل دینے کی تحریک ہے، جس کی سربراہی زیادہ تر یا تو لبنان کے عیسائی کر رہے ہیں یا مسلمانوں میں سے وہ فرنگیت زدہ لوگ جو دین کو اپنے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تصور کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس قصیدے پر مصر کی موجودہ حکومت نے قروی کو نشان القداسہ (MEDAL OF HOLINESS) عطا فرمایا ہے اور عرب قوم پرستوں کے حلقے میں

وہ "قدیس القومیۃ العربیہ" کے خطاب سے نوازا جاتا ہے یعنی عرب قومیت کا مہا پروہت (HIGH PRIEST)

اس روز جمعہ تھا۔ نماز کے وقت سے کچھ پہلے استاذ عبدالحکیم عابدین اپنے ایک دوست شیخ عبداللہ المشعری کے ساتھ تشریف لائے جو سعودی حکومت کی وزارتِ قانون کے سکرٹری ہیں ان کے ساتھ ہم یونیورسٹی کے قریب ایک مسجد میں جمعہ پڑھنے کے لیے گئے۔ ایک نوجوان خطیب خطبہ دے رہا تھا۔ خطبہ کیا دے رہا تھا، اس نے پہلے سے ایک خطبہ کاغذ پر لکھ رکھا تھا یا کہیں سے نقل کر لیا تھا اور اسی کو پڑھ رہا تھا۔ سنا ہے کہ ریاض میں بڑے بڑے علماء تک کا یہی حال ہے۔ حتیٰ کہ مفتیٔ اکبر شیخ محمد بن ابراہیم بھی "مجموعہ خطب ایام الجمعۃ" نامی کتاب سے ایک خطبہ زبانی یاد کر کے سنا دیتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ بڑے بڑے دینی مناصب آل الشیخ (شیخ محمد بن عبدالوہاب کے خاندان) کے لیے مخصوص ہیں اور دوسرے لوگ صرف اسی صورت میں کسی بڑے دینی منصب پر مقرر کیے جاتے ہیں جبکہ آل الشیخ میں کوئی آدمی موجود نہ ہو۔ حرم مکی کے خطیب اگرچہ شیخ عبدالمہیمن (مصری) ہیں، لیکن وہ حرم کے خطیبِ اول نہیں ہیں، بلکہ خطیب اول آل الشیخ کے ایک فرزند شیخ عبدالعزیز بن حسن ہیں، جو وزارتِ تعلیم کے سکرٹری ہیں اور سارا سال ریاض میں رہتے ہیں۔ البتہ کبھی کبھار مکہ معظمہ جا کر حرم میں خطبہ دے آتے ہیں۔

کلیۃ الشریعہ کے طلبہ کا اجتماع | عصر کے بعد ہم اپنے پروگرام کے مطابق کلیۃ الشریعہ کے طلبہ کے اجتماع میں گئے۔ کوئی پچیس کے قریب طلبہ تھے، جن میں سے اکثر شامی تھے۔ انہوں نے مولانا سے بے انتہا عقیدت و محبت کا اظہار کیا اور پھر مختلف علمی موضوعات، خصوصاً اس زمانہ میں دعوتِ اسلامی کا کام کرنے کے متعلق سوالات کرتے رہے۔

مفتیٔ اکبر شیخ محمد بن ابراہیم سے ملاقات | مغرب کے بعد ہم استاذ عبدالحکیم عابدین کے ساتھ مفتیٔ اکبر شیخ محمد بن ابراہیم سے ملاقات کے لیے ان کے مکان پر پہنچے۔ یہ بھی پیدائشی نابینا ہیں اور اس وقت آل الشیخ کے سب سے بڑے اور بارسوخ بزرگ ہیں۔ کسی خاص موضوع پر گفتگو نہیں

ہوئی، عام قسم کی باتیں ہوتی رہیں یا پھر ہمارا سفر اور اس کا پروگرام موضوع گفتگو رہا۔

شیخ عمر بن حسن اور محکمہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر اگلے دن ۱۲ نومبر، صبح کے وقت شیخ عمر بن حسن چند دوسرے علماء کے ساتھ مولانا کی ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ یہ آل الشیخ میں سے ہیں اور پوری سعودی حکومت کے محکمہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے صدر ہیں۔ حکومت سعودیہ کی نہایت قابلِ تعریف خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ اس میں ایک باقاعدہ محکمہ اس کام کے لیے مقرر ہے کہ شریعت کے منکرات کی روک تھام کرے اور معروفات کا حکم دے۔ اس محکمہ کی اپنی الگ پولیس اور جیل ہے۔ یہ محکمہ ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے جس کی بدولت مغربیت کا سیلاب اس مملکت میں اس شدت کے ساتھ اب تک نہیں آسکا ہے جس کا مشاہدہ دوسرے مسلم ممالک میں ہو رہا ہے۔ شیخ عمر بن حسن بڑے ہی ہنس مکھ اور فصیح اللسان آدمی ہیں۔ جتنی دیر بیٹھے رہے بڑی شیریں اور مؤثر زبان میں خدا اور رسول کی باتیں کرتے رہے جن سے محسوس ہوا کہ ان کے دل میں اعلائے کلمۃ الحق اور اصلاحِ خلق کا گہرا جذبہ ہے۔ آخر میں وہ مولانا کو مفتی اکبر کے چھوٹے بھائی شیخ عبداللطیف بن ابراہیم (جو ریاض میں کلیۃ الشریعہ اور دینی تعلیم کے دوسرے تمام ادارات کے نگرانِ اعلیٰ ہیں) سے ملاقات کرانے کے لیے کلیۃ الشریعہ لے گئے۔ اس روز مجھے اور چودھری صاحب کو بازار کا ایک ضروری کام تھا، اس لیے ہم مولانا کے ساتھ کلیۃ الشریعہ نہ جا سکے۔

مولانا نے کلیہ میں شیخ عبداللطیف کے علاوہ دوسرے اساتذہ سے بھی ملاقات کی، اور ان کے درس بھی سنے۔ مولانا نے واپس آکر بتایا کہ تمام درس فصیح زبان میں تھے اور تمام اساتذہ اچھی تیاری کے بعد لیکچر دے رہے تھے۔ شیخ مناع القطان اور شیخ عبدالرزاق عفیفی کے لیکچر مولانا کو خاص طور پر پسند آئے۔ شیخ عفیفی اس کالج میں فقہ کے استاذ ہیں۔ دراصل مصری ہیں، لیکن اب انہوں نے سعودی شہریت اختیار کر لی ہے۔ شیخ محمد حامد الفقی کے انتقال کے بعد مصر کی جمعیۃ انصار السنۃ المحمدیہ[1] کے صدر بھی مقرر کیے گئے ہیں۔ بہت ہی باعلم اور نہایت حلیم الطبع اور منکسر المزاج آدمی ہیں۔ ہیں تو مصری، لیکن اپنی داڑھی سے ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ ہندوستان یا پاکستان کے علماء میں سے ہیں۔

[1] یہ مصر میں جمعیت اہل حدیث کی طرز کی جماعت ہے اور اس کا مسلک بھی وہی ہے جو ہمارے ہاں کے اہل حدیث کا ہے۔

ریاض میں چند سال ہوئے جامعۃ الملک سعود کے نام سے ایک یونیورسٹی قائم ہو چکی ہے اور اس وقت اس کے تحت چار کالج: کلیۃ الآداب (آرٹس کالج)، کلیۃ العلوم (سائنس کالج)، کلیۃ التربیہ (ٹریننگ کالج) اور کلیۃ الطب (میڈیکل کالج) ریاض میں قائم ہیں اور ایک کالج کلیۃ الشریعہ کے نام سے مکہ معظمہ میں چل رہا ہے۔ ریاض کا شریعت کالج یعنی کلیۃ الشریعہ یونیورسٹی کے ماتحت نہیں ہے، بلکہ اپنی جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ دراصل (جہاں تک ہم نے سنا ہے) اس وقت سعودی عرب میں بھی علماء اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ (جو یونیورسٹی اور حکومت کے نظم و نسق پر حاوی ہے) کے درمیان اختلاف رونما ہو چکا ہے اور ایک طرح کی کشمکش کی صورت اختیار کر تا جا رہا ہے۔ یونیورسٹی قائم ہونے سے پہلے ریاض کے علماء اپنے گھروں پر درس کی مجلسیں قائم کرتے تھے اور ان ہی کی سند، سندِ فراغت خیال کی جاتی تھی لیکن جب یونیورسٹی قائم ہوئی اور اس کے تحت کالج اور جابجا ابتدائی اور ثانوی مدرسے کھولے گئے تو یونیورسٹی والوں نے دینی علوم کی تعلیم بلکہ صحیح معنوں میں عدالتوں کے لیے قاضی اور وکیل پیدا کرنے کے لیے بھی مصر و شام کے طرز پر دینی کالج قائم کرنا چاہا لیکن علماء ایک تو اپنے آپکو یونیورسٹی کے تحت دینا پسند نہ کرتے تھے اور دوسرے انہیں یہ گوارا نہ تھا کہ جس طریق پر اب تک دینی علوم کی تدریس کا سلسلہ چلتا رہا ہے، اس میں تغیر کیا جاتے۔ بالآخر جس بات پر یہ کشمکش ختم ہوئی، یا یوں کہیے کہ فی الحال رکی ہوئی ہے، وہ یہ کہ یونیورسٹی والوں نے ریاض میں دوسرے کالج تو قائم کیے لیکن اپنا کلیۃ الشریعہ مکہ معظمہ میں کھولا۔ دوسری طرف علماء کی مجالسِ تدریس کو بھی ایک باقاعدہ تشکل دینے کے لیے کلیۃ الشریعہ ہی کے نام سے ایک کالج ریاض میں کھول دیا گیا جس کا سارا نظم و نسق، نصاب اور ہر چیز علماء کی مرضی کے مطابق طے پاتی ہے۔ ریاض اور مکہ معظمہ کے کلیۃ الشریعہ میں فرق یہ ہے کہ ریاض کے کلیۃ الشریعہ کے ہر طالب علم کو ماہانہ تین سو ریال (تقریباً ۴۰۰ روپیہ) اور اس کے تحت جو دینی مدارس ہیں ان کے ہر طالب علم کو ماہانہ ۱۵۰ ریال (تقریباً ۲۰۰ روپیہ) وظیفہ دیا جاتا ہے لیکن فارغ التحصیل ہونے کے بعد اس کے لیے ملازمت کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ کسی مسجد میں خطابت یا دینی مدرسہ میں تدریس کی جگہ خالی ہو اور قسمت یاوری کرے تو وہ اسے

پُر کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس مکہ معظمہ کے کلیۃ الشریعہ کے طلبہ کو یونیورسٹی کے دوسرے کالجوں کی طرح تعلیم کے دوران کوئی وظیفہ نہیں دیا جاتا، لیکن فارغ التحصیل ہو جانے کے بعد ان کے لیے ملازمت کی ضمانت ہے۔ جب تک ملازمت نہیں دی جائے گی، ان میں سے ہر ایک کو ۱۲۰۰ ریال (۱۶۰۰ روپیہ) ماہانہ لازماً ملتے رہیں گے۔ اس طرح گویا سعودی مملکت کے اندر بھی دین اور دنیاوی تعلیم کے دو الگ الگ نظام بن رہے ہیں۔ اس وقت تو حالت ملی جلی سی چل رہی ہے، لیکن چند سال کے بعد کیفیت یہ ہو جائے گی کہ حکومت کی عام مشینری کے لیے کارکن یونیورسٹی کے کے دوسرے کالجوں سے نکلیں گے، عدالتوں کے قاضی اور وکیل مکہ معظمہ کے کلیۃ الشریعہ سے حاصل ہوں گے اور مساجد کے لیے خطیب اور امام ریاض کا کلیۃ الشریعہ مہیا کرے گا، یعنی اسی قسم کے جدا جدا عناصر پیدا ہو جائیں گے، جس طرح کے دوسرے عرب ممالک میں پائے جاتے ہیں۔

استاذ حمد الجاسر

کلیۃ الشریعہ سے واپسی پر مولانا نے استاذ حمد الجاسر سے ان کے پریس میں ملاقات کی اور تفصیلی ملاقات کے لیے ان سے اگلے دن کا وقت لیا۔ استاذ حمد الجاسر ریاض کے ادیب بلکہ صحیح معنوں میں شیخ الادباء شمار کیے جاتے ہیں۔ ریاض کے متعلق کوئی گفتگو یا مضمون اس وقت تک مکمل کہا ہی نہیں جا سکتا، جب تک اس میں حمد الجاسر کا ذکر نہ ہو۔ یہ نجد ہی کے رہنے والے اور اس زمانہ میں عرب کے جغرافیہ پر جو چند آدمی سند مانے جاتے ہیں ان میں سے ایک ہیں عرب جغرافیہ کے متعلق ان کے تحقیقاتی مضامین مجمع علمی کے ماہانہ پرچہ میں اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ چند سال سے انہوں نے ریاض میں مطابع الریاض کے نام سے سب سے پہلا پریس قائم کیا ہے اور اب اس سے ایک ہفتہ وار اخبار "الیمامہ" بھی شائع کر رہے ہیں۔ آج سے چند ماہ پیشتر تک ان کا یہ پرچہ ریاض سے شائع ہونے والا واحد پرچہ تھا، لیکن اب وہاں سے ایک اور ہفتہ وار پرچہ "القصیم" اور ایک ماہنامہ "الجزیرہ" بھی شائع ہونا شروع ہو گیا ہے۔ مولانا ان سے مل کر اپنے سفر کے متعلق معلومات اور بعض اہم تاریخی مقامات کی تحقیق کرنا چاہتے تھے۔ وہ سخت مشغول تھے اور یوں بھی پریس کی کھٹا کھٹ میں کسی تفصیلی گفتگو کا ہونا مشکل تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنے مکان پر

تفصیلی ملاقات کے لیے مولانا کو اگلے دن کا وقت دیا۔

علماء کی سادگی | تین بجے بعد دوپہر ہم شیخ عبدالعزیز بن باز کے ہاں گئے۔ انہوں نے ہمیں کھانے پر بلایا تھا۔ عرب ممالک خصوصاً نجد، حجاز اور شام کے لوگ دوپہر کا کھانا بڑی ہی دیر سے کھاتے ہیں یعنی تین اور چار بجے کے درمیان، اور پھر سنا ہے کہ رات کا کھانا یا تو کھاتے ہی نہیں یا اگر کھاتے ہیں تو بہت ہلکا کھاتے ہیں، اسی لیے ان کی جو دعوتیں بھی ہوتی ہیں دوپہر ہی کے کھانے پر ہوتی ہیں۔ شیخ عبدالعزیز بن باز کے ہاں اور بھی متعدد اصحاب مدعو تھے، جن میں اکثر ان کے شاگرد اور عقیدت مند ہی تھے۔ کھانا بالکل سادہ اور خالص عربی انداز پر تھا۔ یہاں علماء کی سادگی اور امراء کی شان و شوکت دونوں قابلِ دید ہیں۔ اکثر علماء اب تک بڑی سادہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ خصوصاً شیخ عبدالعزیز بن باز تو نہایت ہی سادہ رہتے ہیں۔ البتہ بعض علماء اب آہستہ آہستہ امیرانہ شان کی طرف پیش قدمی کرنے لگے ہیں۔

عصر کے بعد ہم اپنے ہوٹل واپس آئے اور خیال تھا کہ کچھ دیر آرام کیا جائے، مگر فوراً ہی کلیتہ الشریعہ کے چند طلبہ آگئے اور مختلف علمی مسائل پر مولانا سے گفتگو کرتے رہے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ عرب قومیت کا زہر نہ صرف ریاض کی یونیورسٹی بلکہ کلیتہ الشریعہ تک میں سرایت کرتا جا رہا ہے۔ ان میں سے ایک طالب علم نے مولانا کو عرب قومیت کے خلاف لکھا ہوا اپنا ایک مضمون بھی سنایا اور مولانا سے اس کے سلسلے میں مشورہ لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد دو صاحب حضر موت کے اور ایک صاحب انڈونیشیا کے بھی آگئے۔ مغرب کی نماز کے بعد نو کے قریب پاکستانی حضرات تشریف لائے جو ان دنوں تعلیم یا معاش کے سلسلے میں ریاض میں قیام پذیر ہیں۔ ہمارا کمرہ پوری طرح بھر گیا۔ کچھ دیر تو ہم ان کے ساتھ بیٹھے، لیکن مغرب کے بعد ہی چونکہ ہمارا پروگرام شیخ عبداللطیف بن ابراہیم اور امیر عبداللہ بن عبدالرحمٰن کے ہاں جانے کا تھا۔ اس لیے ہم نے ان لوگوں کو شکریہ اور معذرت کے ساتھ رخصت کر دیا۔ پہلے ہم لوگ شیخ عبداللطیف کے ہاں حاضر ہوئے۔ ان سے کلیتہ الشریعہ کے نظام تعلیم اور اساتذہ کے متعلق گفتگو رہی۔ کلیتہ الشریعہ کا

نصاب دینے کا انہوں نے وعدہ کیا، مگر بعد میں شاید وہ بھول گئے اور ہمیں بھی یاد دہانی کرانے کا موقع نہ مل سکا، اس لیے ہم یہ نصاب حاصل نہ کر سکے۔

امیر عبداللہ بن عبدالرحمٰن اس کے بعد ہم امیر عبداللہ بن عبدالرحمٰن کے ہاں پہنچے۔ وہ اپنے قصر پر موجود تھے اور انہوں نے بہت تپاک سے ہمارا استقبال کیا۔ پاکستان اور ہندوستان کے مسائل پر گفتگو کرتے رہے۔ ان کی گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا کہ نہایت باعلم اور باطلاع قسم کے آدمی ہیں اور اخبارات اور کتابوں کا برابر مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ ان کی ذاتی لائبریری بڑی وسیع ہے اور وہ اس میں برابر اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ انہوں نے مولانا کی چند کتابیں پہلے سے پڑھی ہوئی تھیں، بقیہ کتابوں کے مطالعہ کا انہوں نے شوق ظاہر فرمایا اور ہم نے ان سے عربی کتابوں کا ایک مکمل سیٹ دینے کا وعدہ کیا (جسے اگلی ملاقات پر ہم نے ان کی خدمت میں پیش کر دیا)۔

گفتگو کے دوران درعیہ کا ذکر آیا، تو انہوں نے فرمایا کہ "درعیہ یہاں سے تقریباً پندرہ میل کے فاصلہ پر ہے۔ وہاں میرا اپنا قصر ہے۔ اس لیے میں آپ لوگوں کو پرسوں وہاں آنے اور شام تک وہیں ٹھہرنے کی دعوت دیتا ہوں، تاکہ آپ لوگ درعیہ کی تباہی کے آثار بھی دیکھ سکیں اور میرے باغ کی سیر بھی کر سکیں"۔ ہم نے بخوشی اس دعوت کو قبول کر لیا۔

عشاء کے بعد ہم شیخ عمر بن حسن کے ہاں حاضر ہوئے۔ دوسرے علماء کی نسبت ان کا مکان پختہ اور شاندار ہے اور کسی گلی میں ہونے کے بجائے ایک بڑی سڑک کے کنارے واقع ہے۔ اس وقت ان کے پاس محکمہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے سپاہیوں کا ایک دستہ موجود تھا اور غالباً وہ ان کی دن بھر کی کاروائی کا جائزہ لے رہے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی انہیں رخصت کر دیا۔ گفتگو میں وہ مولانا کے کارناموں — بقول ان کے "جہاد" — کی مناسبت سے صحابہ کرام اور سلف صالحین کے فضائل اور مجاہدین کے اجرِ عظیم کا ذکر فرماتے اور مولانا کو بار بار دعائیں دیتے رہے۔ پھر ان کی گفتگو کا رخ تقلید کی مذمت اور اس کے رد میں ائمہ اربعہ کے اقوال کی طرف پھر گیا۔ خوشی ہوئی کہ یہ لوگ کم از کم نظری لحاظ سے تو تقلید کے قائل نہیں ہیں۔ خواہ یہ عملاً حنبلی علماء

ہی کی قدیم کتابیں پڑھتے اور پڑھاتے ہوں اور ان کا دائرہ علم ان ہی تک محدود ہو۔ دراصل ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ ہم امام احمد بن حنبلؒ کی تقلید نہیں کرتے بلکہ ان کا اتباع کرتے ہیں اور اگر کبھی ان کا یا امام ابن تیمیہؒ و ابن قیمؒ کا کوئی قول حدیث کے خلاف محسوس کرتے ہیں تو اسے ترک کر دیتے ہیں۔

خود امام ابن قیمؒ نے اپنی کتاب "اعلام الموقعین" میں اور شیخ محمد بن عبدالوہاب نے اپنی بعض کتابوں میں ائمہ کی تقلید سے منع کرتے ہوئے ان کے اتباع کی طرف دعوت دی ہے۔

استاذ حمد الجاسر کی لائبریری

اگلے دن ۲۲ر نومبر کو علی الصباح استاذ حمد الجاسر ہوٹل پر تشریف لائے اور ہمیں ایک ٹیکسی میں بٹھا کر اپنے گھر لے گئے۔ وہاں دو کمروں میں ان کی ذاتی لائبریری تھی، جو نہایت قیمتی کتابوں پر مشتمل تھی۔ وہاں ان کی عالمانہ شان دیکھنے میں آئی۔ کتابیں دکھانے لگے تو انہیں کسی چیز کا ہوش نہ رہا۔ اپنے زنان خانہ سے چائے لاتے، لیکن اسے درمیان ہی میں رکھ دیا اور کتابوں کے دیکھنے دکھانے میں غرق ہو گئے۔ یہاں تک کہ وہ ٹھنڈی ہو گئی، بلکہ کتاب لگنے سے ایک پیالی ٹوٹ بھی گئی۔ مگر انہوں نے اس کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ کسی مقام کے متعلق ہم سوال کرتے تو وہ فوراً بتاتے کہ یہ مقام کہاں واقع ہے، اس کا پرانا نام کیا تھا اور اب کس نام سے مشہور ہے۔ اگر کبھی کسی مقام کے متعلق شبہ ہوتا تو متقدمین کا کوئی شعر پڑھتے اور اس سے اس مقام کی تحقیق کر لیتے۔ تین گھنٹے تک ہم ان کے پاس رہے۔ مولانا نے عرب کے مختلف مقامات و آثار کے متعلق ان سے معلومات حاصل کیں۔ کچھ مجھے کاپی پر نوٹ کرا دیں اور کچھ اپنے نقشے پر پنسل سے درج کر لیں۔ فارغ ہونے کے بعد ہم نے ان سے اجازت چاہی تو وہ ہمیں دور تک پیدل چھوڑنے آئے۔ کیونکہ سڑک جس پر ٹیکسی مل سکتی تھی، ان کے گھر سے فاصلہ پر تھی۔

ظہر کے بعد شیخ عبدالعزیز بن باز کے ایک شاگرد شیخ محمد حسن کے ہاں ہماری کھانے کی دعوت تھی۔ شیخ عبدالعزیز اور ان کے تمام شاگرد و عقیدت مند بھی مدعو تھے۔ شیخ محمد حسن فلسطینی مہاجر ہیں اور نابلس کے قریب کے رہنے والے ہیں۔

امیر مساعد بن عبدالرحمٰن

اس کے بعد ہم استاذ عبدالحکیم عابدین کے ساتھ امیر مساعد بن عبدالرحمٰن

سے ملنے کے لیے ان کے مکان پر پہنچے۔ امیر مساعد مولانا سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ وہ پہلے سے مولانا کو اچھی طرح جانتے تھے۔ ۴۹ء میں حج کے موقع پر یہ مکہ معظمہ میں موجود تھے۔ حج سے پہلے ایک دن انہوں نے مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کو بڑے شوق سے اپنی جائے قیام پر بلایا اور ان سے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے متعلق تفصیلی گفتگو کی۔ مولانا مسعود عالم نے انہیں مولانا مودودی کی وہ تمام کتابیں بھی پیش کی تھیں جو اس وقت تک چھپ چکی تھیں۔ اب کی مرتبہ انہوں نے مولانا کی مزید کتابوں کی فرمائش کی، جن کے مہیا کرنے کا ہم نے وعدہ کیا (اور اگلی ملاقات پر ان کی خدمت میں پیش کر دیا)۔ امیر مساعد نے بتایا کہ جب شاہ سعود پاکستان گئے تھے اس وقت میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ مولانا اس وقت جیل میں تھے۔ شاہ سعود نے مسٹر غلام محمد گورنر جنرل سے مولانا کو رہا کرنے کی سفارش کی، مگر انہوں نے یہ جواب دیا کہ مولانا معافی مانگ لیں تو ہم انہیں رہا کر دیں، مگر چونکہ مولانا نے معافی نہیں مانگی، اس لیے رہائی نہ ہو سکی۔ اس کے بعد امیر مساعد نے مولانا کو ان کی ثابت قدمی پر داد دی اور ان کے لیے خدا کے ہاں اجر کی دعا کی۔ انہوں نے فرمایا کہ معافی مانگ لینے کا مطلب تو یہ ہوتا کہ مولانا اپنے آپ کو مجرم مان لیتے۔ ہمارے سفر کے متعلق گفتگو شروع ہوئی تو امیر مساعد نے ہمیں یقین دلایا کہ سفر میں سہولتوں اور تمام مقامی امراء کو ہدایات کے سلسلے میں جو کچھ ممکن ہے اس میں وہ اور سعودی حکومت کے دوسرے کارکن کوتاہی نہ کریں گے۔ امیر مساعد بالکل نوعمر نظر آتے ہیں۔ داڑھی صاف کرتے ہیں، اس لیے ان کا عمر کا اندازہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے ان کے جسم کی ساخت ہی ایسی ہو یا واقعی ان کی عمر کم ہو، کیونکہ ان کے والد عبدالرحمن بن فیصل کا انتقال ۳۲ھ میں ہوا ہے۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد ہم نے اجازت چاہی اور ہوٹل واپس آگئے۔

عصر کے بعد ہفوف کے مشائخ کے چار صاحبزادے مولانا کی ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ انہوں نے مولانا کی اکثر عربی کتابیں پہلے سے پڑھی ہوئی تھیں اور ان سے خوب

واقف تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ہفوف کے علماء کو مولانا کی آمد کا سخت انتظار رہا، لیکن جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ مولانا سیدھے ریاض پہنچ گئے ہیں تو انہیں سخت افسوس ہوا۔ مولانا سے ان صاحبزادوں کی گفتگو کچھ تو ہفوف کے آثار کے متعلق رہی اور کچھ کتاب "پردہ" کی مناسبت سے عرب ممالک میں بے پردگی و بے دینی کی رو کے متعلق۔ الحمدللہ پردہ کے متعلق نجد کے علماء مولانا کی رائے سے متفق ہیں، ورنہ دوسرے عرب ممالک کے علماء نے تو اس بارے میں عملی تو عملی، فکری اعتبار سے بھی ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔

مغرب کے بعد کلیۃ الشرعیہ کے طلبہ کا ایک جم غفیر آ پہنچا جس میں کچھ طلبہ پاکستان و ہندوستان کے بھی تھے۔ طلبہ اور مشائخ کی آمد نے ہوٹل کے مالک کی بھی آنکھیں کھول دیں۔ شروع میں ایک آدھ دن اس نے ہمیں کوئی اہمیت نہ دی تھی، لیکن اب وہ ہمارا بہت ہی خیال رکھنے لگا۔ اس نے ہمارے کمرے میں بہت سی مزید کرسیوں کا اضافہ کر دیا، لیکن آنے والوں کے لیے وہ بھی ناکافی تھیں۔ بہت سے طلبہ کو چارپائیوں پر بھی بیٹھنا پڑا۔

شیخ عبداللہ بن خمیس | عشاء کے بعد شیخ عبداللہ بن خمیس بھی تشریف لائے۔ یہ ریاض کے ایک بڑے سرکاری عہدہ دار ہیں لیکن ادب سے انہیں خاصی دلچسپی ہے۔ ادبی موضوعات پر ان کی بعض کتابیں بھی ہیں۔ فقہ اور تاریخ و جغرافیہ پر بھی ان کی اچھی نگاہ ہے۔ درعیہ کے رہنے والے ہیں اور اب بھی اکثر وہاں جاتے رہتے ہیں۔ مولانا سے مختلف فقہی اور تاریخی مسائل پر گفتگو کرتے رہے۔ پاکستان اور کشمیر کے حالات پر بھی بعض سوالات کیے۔ مولانا کے جوابات کا ان پر اور تمام طلبہ پر اچھا اثر پڑا۔ رات کے بارہ بجے کے بعد یہ حضرات واپس تشریف لے گئے، یہاں تک کہ ہمیں درمیان میں کھانا کھانے کا بھی موقع نہ ملا۔ اس کے بعد ہمیں کھانا کھایا۔

تعارفِ کتب

تحدیدِ نسل | مرتبہ: مولانا محمد جعفر پھلواروی۔ ناشر: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ پاکستان، لاہور۔ قیمت ۱۲/

تہذیبِ جدید کی ترقی کے بعد جتنے بیشمار نئے مسائل لوگوں کے سامنے آئے ان میں ایک تحدیدِ نسل بھی ہے۔ مغربی ممالک میں اس مسئلہ کے موافق و مخالف دونوں پہلوؤں پر سیر حاصل بحث ہو چکی ہے اور دونوں طرف کے دلائل کھل کر لوگوں کے سامنے آ گئے ہیں۔ پاکستان میں جب یہ مسئلہ لوگوں کے سامنے پیش ہوا تو مغربی ممالک کے مذہبی و اخلاقی رہنماؤں کی طرح یہاں کے اہلِ دین نے بھی اس پر اعتراضات کیے۔ زیرِ تبصرہ کتاب انہیں اعتراضات کے رد میں لکھی گئی ہے اور اس میں بتایا گیا ہے کہ علماء وقت کے تقاضوں کو نہیں سمجھتے اور قرآن و سنت سے انہوں نے اس کے خلاف جو استدلال کیا ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے۔ اس کتاب میں جتنے مباحث اٹھائے گئے ہیں چونکہ اُن کی زیادہ تر بنیاد قرآن و سنت پر رکھی گئی ہے اس لیے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مندرجات پر پوری طرح غور کیا جائے۔

کتاب کے مطالعہ کے بعد پہلا تاثر جو ذہن پر مرتب ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک ہی قسم کے دلائل ہیں جنہیں بار بار دہرایا گیا ہے۔ قرآن و سنت کے حوالوں کے بارے میں تو اس احساس کو اور بھی تقویت پہنچتی ہے۔ کتاب کے فاضل مرتب مولانا شاہ محمد جعفر ندوی پھلواروی اس تکرار کی وجہ بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "جب نفسِ مضمون سے متعلق آیات و احادیث کا ذکر آئے گا تو ظاہر ہے کہ ہر مضمون میں خود ساختہ نئی آیتیں یا نئی حدیثیں نہیں لائی جاسکتیں۔ آیتیں بھی وہی ہونگی جو قرآن میں ہیں اور حدیثیں بھی وہی ہونگی جو کتبِ احادیث میں ہیں۔"

یہ بات اپنی جگہ بالکل صحیح اور درست ہے لیکن ہم اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے باوجود

یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آخر اس کتاب کے سارے مقالہ نگاروں کی نگاہ ہیر پھیر کر ایک ہی نوعیت کی آیات و احادیث پر کیوں مرکوز رہی۔ قاضی محمد بن علی بن محمد الشوکانی کی جس فاضلانہ تصنیف نیل الاوطار سے ان حضرات نے تحدید نسل کا جواز نکالا ہے اُسی میں نہایت واضح الفاظ میں اس کی مخالفت بھی موجود ہے اور عزل کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی اس میں نقل ہوا ہے کہ یہ الوأد الخفی (درپردہ اولاد کشی) ہے۔ ملاحظہ ہو نیل الاوطار جزو پانچ صفحہ ۲۰۹ باب ما جاء فی العزل۔

پھر اس سے بھی زیادہ ایک تعجب انگیز بات یہ بھی دیکھنے میں آئی ہے کہ اگر ایک مقالہ نگار سے حدیث کے نقل کرنے میں سہو ہو گیا ہے تو سب نے وہی غلطی کی ہے اور خود کتاب اٹھا کر دیکھنے کی قطعاً زحمت گوارا نہیں کی۔

خلیفہ عبدالحکیم صاحب نے مرحوم نے اپنے مضمون میں بخاری شریف کے حوالہ سے ابو سعید خدری کی روایت نقل کی ہے۔ مگر شروع میں جو الفاظ تھے اور جو درحقیقت اس کے پس منظر کو واضح کرتے ہیں انہیں حذف کر دیا ہے۔ اصل حدیث یوں شروع ہوتی ہے: وعن ابی سعید قال خرجنا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی غزوۃ بنی المصطلق فاصبنا سبیاً من العرب فاشتھینا النساء واشتدت علینا العُزبۃ واحببنا العزل۔۔۔ ”ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ بنی المصطلق کے لیے نکلے، لڑائی میں عرب کی قیدی عورتیں ہاتھ آئیں، سو مسافرت کی حالت میں) تجرّد ہم پر شاق گزر رہا تھا۔ ان عورتوں سے ہم نے تمتع کرنا چاہا اور ہم یہ بھی چاہتے تھے کہ ان سے عزل کریں۔۔۔“۔

دلوں کے راز تو اللہ ہی جانتا ہے مگر قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ صاحب نے روایت کے اس حصے کو اس لیے نظر انداز کر دیا کہ اس کے ہوتے ہوئے اُن کا مقصد پورا نہ ہو سکتا تھا۔ یہاں عزل کا ذکر اُن عورتوں سے متعلق ہے جو میدان جنگ میں قیدی بن کر مسلمانوں کے قبضے میں آئی تھیں اور مسلمان عزل اس لیے کرنا چاہتے تھے کہ اگر وہ حاملہ ہو گئیں اور ان سے اولاد ہو گئی تو پھر انہیں ہمیشہ کے لیے رکھنا پڑے گا۔ کیونکہ شریعت کی رُو سے جب لونڈی اپنے مالک کے بچہ کی ماں

ہو جائے تو پھر اس کی بیع و شریٰ ناجائز ہو جاتی ہے۔ یہ بالکل ایک استثنائی صورت تھی جسے بڑی ہوشیاری کے ساتھ عمومیت کا رنگ دیا گیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایک دعا بھی منسوب کی گئی ہے جس سے کتاب کے سارے مقالہ نگار یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ حضورؐ نے قلتِ مال اور کثرتِ اولاد سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگی تھی۔ اصل حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یتعوذ من جھد البلاء ودرک الشقاء وسوء القضاء وشماتۃ الاعداء (بخاری، کتاب الدعوات) "اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں تنگ حالی سے اور ہلاکت میں پڑنے سے اور بدقسمتی سے اور دشمنوں کی خندہ زنی سے"۔ فاضل مقالہ نگاروں کے قلم کی کرشمہ سازی دیکھیے کہ انہوں نے حدیث کے راوی حضرت سفیان کے یہ الفاظ حذف کر دیئے ہیں کہ الحدیث ثلث زدت انا واحدۃً لا ادری ایتھن ھی "یعنی حضورؐ سے تین فقرے منقول ہوئے تھے، ایک فقرہ میں نے بڑھا دیا اور اب مجھے یاد نہیں ہے کہ میرا بڑھایا ہوا فقرہ کونسا ہے"۔ اس سے حدیث کی صحت خود ہی مشکوک ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ جو الفاظ حضور سرور دو عالم کی طرف منسوب کیے گئے ہیں ان میں بھی تمام مضمون نگاروں نے علمی دیانت کا ثبوت نہیں دیا۔ کسی نے یہ ہمت نہیں کی کہ ان روایات کا حوالہ دیا جائے جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود "جہد البلاء" سے مراد "قلتِ مال اور کثرتِ عیال" بیان فرمائی ہو۔ حدیث کی کتابوں میں یہ تشریح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نہیں بلکہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ علامہ ابن حجر لکھتے ہیں: قیل المراد بجھد البلاء قلۃ المال وکثرۃ العیال کذا جاء عن ابن عمرؓ (فتح الباری جزء ۲۶۔ کتاب الدعوات التعوذ من جہد البلاء) "کہا گیا کہ جہد البلاء سے مراد مال کی قلت اور اولاد کی کثرت ہے"۔ یہ ابن عمرؓ سے منقول ہے۔

اسی طرح علامہ نووی شرح مسلم میں فرماتے ہیں: واما جھد البلاء فروی عن ابن عمرؓ انہ فسرہ بقلۃ المال وکثرۃ العیال (شرح مسلم نووی باب الدعوات والتعوذ) "جہد البلاء کی تشریح ابن عمرؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا اس سے مراد ہے قلتِ مال اور کثرتِ عیال"۔ مشکوٰۃ اور بخاری ہر دو

کتب کے حاشیہ پر یہ الفاظ درج ہیں:

وقیل قلۃ المال وکثرۃ العیال — یہاں بھی "قیل" کہا گیا ہے۔ جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمائی۔ بلکہ کسی اور نے کہی ہے۔ اب یہ کس قدر زیادتی ہے کہ بلا کسی ثبوت کے ایک بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دی جائے۔ اور پھر اس سے ایک حکم شرعی نکالنے کی کوشش کی جائے

فاضل مضمون نگاروں میں سے بیشتر حضرات نے صحیح مسلم کی اس حدیث کا ذکر کیا ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے۔ کہ غزوہ بنی مصطلق میں صحابہ نے عرب کی قید کی ہوئی عورتوں سے عزل کیا اور پھر حضور سرور کائنات سے اس بارے میں دریافت کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا۔ لا علیکم الا تفعلوا۔ اس کی شرح میں علامہ نووی فرماتے ہیں۔ معناہ ما علیکم ضرر فی ترك العزل لان کل نفس قدر اللہ تعالی خلقھا لابد ان یخلقھا سواء عزلتم ام لا وما لم یقدر خلقھا لا یقع سواء عزلتم ام لا فلا فائدۃ فی عزلکم اس کے معنی یہ ہیں کہ تم اگر عزل نہ کرو تو کوئی نقصان نہیں۔ اللہ تعالی نے جس نفس کی پیدائش تقدیر میں لکھ دی ہے۔ وہ خواہ تم عزل کر دیا نہ کرو وہ تو بہر صورت پیدا ہو کر رہے گا۔ اور جس کی پیدائش مقدر نہیں ہے وہ خواہ تم عزل کر دیا اس سے باز رہو۔ وہ بہر حال پیدا نہیں ہوگا۔ پھر عزل کا کیا فائدہ؟

تحریر نسل کے فاضل مضمون نگاروں نے "لا علیکم الا تفعلوا کو صرف تعجب تک محدود رکھا ہے، حالانکہ نووی کے قول کے مطابق حضور نے ایک زبردست حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس بات کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو کہ نیل الاوطار ہی میں مروی ہے اس میں آپ نے فرمایا ہے۔

لو ان الماء الذی یکون منہ الولد اھرقتہ علی صخرۃ لاخرج اللہ منھا ولدا۔ اگر اس مادہ منویہ ہی سے جس سے بچہ ہونا ہے اسے تم چٹان پر بھی گرا دو تو اس سے بچہ پیدا ہوگا"

لا علیکم الا تفعلوا کی تشریح میں دوسرے اکابر ملت کے بھی بشیار اقوال موجود ہیں۔ مثلاً قال ابن سیرین ھذا اقرب الی النھی (نیل الاوطار) ابن سیرین

نے کہا۔ یہ قریب قریب ممانعت ہی ہے۔ وحکی ابن عون عن الحسن انه قال واللہ لکان هٰذا
زجرًا (نیل الاوطار) ابن عون عن الحسن نے کہا کہ خدا کی قسم یہ زجر ہے۔ صحیح مسلم میں یہ حدیث موجود ہے کہ ایک
شخص نے حضورؐ سے عرض کی کہ میں اپنی لونڈی سے عزل کرتا ہوں تاکہ وہ حاملہ نہ ہو جائے۔ تو آپؐ نے
فرمایا کہ اس طرح اللہ نے جو پیدا کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ اسے تم روک نہیں سکتے۔ اس کے بعد وہ
پھر آیا اور کہا کہ یا رسول اللہ میری لونڈی جس کا میں نے ذکر کیا تھا وہ حاملہ ہو گئی ہے تو آپؐ نے ارشاد
فرمایا:۔ انا عبد اللہ ورسولہ (باب العزل)

ابن حزم اور ابن حبان ہر دو عزل کی حرمت کے قائل ہیں۔

علامہ نوویؒ اگرچہ اس حد تک تو نہیں گئے۔ مگر یہ ضرور فرماتے ہیں:۔ وھو مکروہ عندنا فی
کل حالٍ وکل امرأةٍ سواء رضیت ام لا۔ لانه طریق الی قطع النسل "یہ فعل ہمارے نزدیک ہر حال
میں مکروہ ہے۔ اور ہر عورت کے معاملہ میں مکروہ ہے۔ خواہ عزل اس کی رضامندی سے کیا جائے
یا ناراضی سے کیونکہ اس سے قطع نسل ہوتا ہے" اس کے بعد تمام احادیث میں توافق کرتے ہوئے وہ رقمطراز ہیں: یان ما ورد فی النھی
محمول علی کراھة التنزیھیة وما ورد فی الاذن فی ذالك محمول علی انه لیس بحرام ولیس معناہ نفی الکراھة (نووی باب حکم العزل)
"کیونکہ جو روایات ممانعت میں وارد ہوئی ہیں وہ کراہت تنزیہی کے معنی میں ہیں اور جن میں اجازت
آتی ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حرام نہیں ہے اور وہ کراہت کے منافی بھی نہیں"

لا علیکم الا تفعلوا کی پیچیدہ بحث کے بعد علامہ شوکانی یوں فرماتے ہیں:

فافھم ثبوت الحرج فی فعل العزل۔ (باب ما جاء فی العزل۔ جزو خامس ص۲۱۰)

کتاب کے فاضل مقالہ نگاروں کو نیل الاوطار میں حضرت عمر فاروقؓ کی یہ حدیث تو نظر آگئی
کہ نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یعزل عن الحرة الا باذنھا لیکن انہیں اسی حدیث
کے سلسلہ میں امام شوکانی کا یہ قول نہ مل سکا جو اس کتاب میں درج ہے:

وحدیث عمر بن الخطاب فی اسنادہ ابن لھیعة وفیه مقال معروف[1]۔ اس کی سند میں ابن لھیعہ

---

[1] ممکن ہے بعض حضرات راو لھیعی والی حدیث کو بھی ضعیف کہنے پر آمادہ ہو جائیں۔ مگر اس کے متعلق حافظ

ہے اور اس کے معتبر ہونے میں جو کلام کیا گیا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔"

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) ابن حجر کا قول ہے: وھذا دفع للاحادیث الصحیحۃ بالتوھم (یہ محض وہم کی بنا پر صحیح احادیث کو رد کرنا ہے)۔ بعض حضرات اسی عزل کو بالکل مباح ثابت کرنے کے لیے یہ حدیث بھی پیش کرتے ہیں: قالت الیھود: العزل الموؤدۃ الصغریٰ فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم کذبت یھود ان اللہ عز وجل لو اراد ان یخلق شیئاً لم یستطع احد ان یصرفہ (رواہ احمد وابوداؤد بحوالہ نیل الاوطار) "یہودی کہتے تھے کہ "عزل چھوٹے پیمانے پر زندہ درگور کرنا ہے" نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر ارشاد فرمایا: یہودیوں نے جھوٹ کہا۔ اگر خدائے بزرگ و برتر کسی نفس کی پیدائش کا ارادہ کرے تو کوئی اُسے روک نہیں سکتا۔"

اس کی جو تشریح علامہ ابن حجر نے کی ہے اُس کو بھی پوری طرح ذہن میں رکھنا چاہیے: الذی کذب فیہ صلی اللہ علیہ وسلم الیھود، ھو زعمھم ان العزل لا یتصور معہ الحمل اصلا وجعلوہ بمنزلۃ قطع النسل بالوأد فاکذبھم واخبر انہ لا یمنع الحمل اذا شاء اللہ خلقہ واذا لم یرد خلقہ لم یکن وأدا حقیقۃ وانما سماہ وأدا خفیا فی حدیث جذامۃ لان الرجل انما یعزل ھربا من الحمل فاجری قصدہ لذالک مجری الوأد۔ "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس بنا پر یہودیوں کو جھوٹا کہا ہے وہ صرف یہ تھی کہ ان کے نزدیک عزل کے معنی گویا یہ تھے کہ اس کے بعد حمل ٹھیرنے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا اس وجہ سے وہ اسے ویسا ہی قاطع نسل سمجھتے تھے جیسے زندہ درگور کرنا۔ حضورؐ نے اُن کی اسی بات کو جھٹلایا اور کہا کہ اگر اللہ کسی نفس کی پیدائش کا ارادہ کرے تو پھر حمل میں کوئی چیز مانع نہیں ہو سکتی اور اگر وہ ارادہ نہ کرے تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ اور یہ ہے تو حقیقتاً قتل اولاد ہی لیکن وأد خفی ہے جیسا کہ جذامہ والی حدیث میں آیا ہے۔ کیونکہ جو آدمی عزل کرتا ہے وہ حمل سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اُس کا مقصد وہی ہے جو زندہ درگور کرنے والوں کا مقصد تھا۔"

علامہ ابن حجر کی اس تشریح سے معلوم ہو جاتا ہے کہ حضورؐ نے دراصل یہود کی جس بات کو جھوٹا کہا ہے وہ یہ نہیں تھی کہ "عزل قتل اولاد" کا ہم معنی ہے، بلکہ دراصل آپؐ نے ان کے اس خیال کو جھٹلایا تھا کہ عزل سے واقعی

(باقی ص ۳۷۵ پر)

اس کتاب کے فاضل مرتب جناب مولانا جعفر شاہ صاحب خود ص۵۵ اور ص۶۵ میں تسلیم کرتے ہیں کہ حضورؐ سرورِ کائنات کے دور میں کثرتِ آبادی کا کوئی مسئلہ نہ تھا، بلکہ اُس وقت کے حالات کے مطابق حضورؐ نے مسلمانوں کو آبادی بڑھانے کی ترغیب دی اور فرمایا "تناکحوا تکاثروا" اس کا مطلب یہ ہُوا کہ حضورؐ سرورِ دوعالمؐ نے عزل کی اگر کبھی اجازت دی بھی تو وہ محض استثنائی صورت تھی، ورنہ حضورؐ نے تحدیدِ نسل کی کوئی تحریک اٹھانے کی طرف کبھی اشارہ نہیں کیا۔ جب آبادی پہلے ہی کم ہو اس وقت اگر کسی شخص یا چند اشخاص کو عزل کی اجازت ملتی ہے تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ اجازت عمومی نہیں بلکہ خصوصی ہے۔ اس بنا پر ان مخصوص رخصتوں کی بنیاد پر ایک اجتماعی تحریک چلانے کے لیے حدیث سے سندِ جواز حاصل کرنا بہت بڑی جسارت ہے جس کی ایک عالمِ دین سے توقع نہیں کی جا سکتی۔ پھر "اہون البلیتین" کے معاملے میں جو استدلال جناب خلیفہ عبدالحکیم صاحب مرحوم نے اپنے مضمون میں کیا ہے اس سے بھی اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ خلیفہ صاحب اسی موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنا بھی ضروری ہے اور ضبطِ ولادت میں بدکاری بڑھنے کا خطرہ بھی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اہون البلیتین کیا ہے؟" (ص۲۱)

اہون البلیتین سے شریعت میں عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ دو یا دو سے زیادہ ناگزیر برائیوں میں اگر آدمی گھر کر بالکل مجبور ہو جاتے اور ان سے مفر کی کوئی صورت بھی نظر نہ آئے تو پھر وہ کم تر درجہ کی برائی کو قبول کرلے۔ ہم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آخر کثرتِ آبادی زنا کے مقابلے میں اہون البلیتین کے تحت کیونکر آتی ہے۔ اول تو یہ مسئلہ اس قدر شدید نہیں جتنا کہ اس کو سمجھا جا رہا ہے۔ خارجی محرکات مثلاً مادیت پرستی، ہوسِ زر، خدا سے عدمِ تعلق اور مغرب

(حاشیہ صفحہ سابق)، اولاد کی پیدائش بند ہو جاتی ہے۔ اسی لیے حضورؐ نے اُن کے اس اعتقاد کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی چیز کی پیدائش کا ارادہ رکھتا ہو تو کوئی اسے اپنے اس ارادہ سے روک نہیں سکتا۔ یہاں عزل کے قاتلِ اولاد ہونے کی نفی نہیں بلکہ درحقیقت اس کے مانعِ حمل ہونے کی نفی ہے اور علامہ ابن حجر کے قول کے مطابق عزل ہے تو حقیقتاً وأد ہی، البتہ یہ ہے "وأدِ خفی" کیونکہ وأد میں دو چیزیں ہوتی ہیں قصد اور فعل اور عزل میں صرف قصد ہوتا ہے۔

کی ذہنی غلامی نے اس مسئلہ کے اندر شدت پیدا کر دی ہے۔ دوسرے اس مسئلہ کو لازمی طور پر قطعِ نسل سے ہی حل نہیں کیا جا سکتا بلکہ انسان کی قوتِ فکر و عمل نے خوراک میں حیرت انگیز ترقی کی ہے اور ابھی اس کے بے پناہ امکانات موجود ہیں۔ یہ محض ایک خود ساختہ خوف ہے جس کو اپنے اوپر طاری کر کے ابوین البلینین کی رخصت سے فائدہ اٹھانے کی تدبیر کی جا رہی ہے۔ تاہم اگر یہ مان لیا جاتے کہ کثرتِ آبادی واقعی کوئی خطرہ ہے تو اسے بڑا خطرہ سمجھنا اور اس کے مقابلے میں ساری قوم کے اندر زنا پھیل جانے کے خطرے کو ہلکا سمجھ کر قبول کر لینا اسلامی طریقِ فکر نہیں ہے۔ شاہ صاحب نے عالمی مردم شماری کی رپورٹ کا حوالہ دیتے ہوئے اس خطرہ کا اظہار کیا ہے کہ "ہر روز ہزارہا نفوس کا اضافہ ہو رہا ہے۔ اضافہ آبادی کی اس رفتار سے ایک دو صدی کے بعد دنیا میں صرف کھڑے ہونے کے لیے جگہ رہ جائے گی اور غذائی اور تعلیمی حالت کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔" شاہ صاحب سے زیادہ اس حقیقت سے کون واقف ہے کہ یہ محض ایک خیالی خطرہ ہے جس کی کوئی حیثیت نہیں۔ اگر آبادی بڑھ رہی ہے تو وسائلِ رزق میں بھی حیرت انگیز اضافہ ہو رہا ہے اور اب تو سائنس دانوں نے اس بات کا کھوج لگا لیا ہے کہ سمندر بھی انسان کی روزی کا وافر سامان مہیا کر سکتا ہے۔ کائنات کے متعلق یہ سکونی (STATIC) نقطۂ نظر ان حضرات کو زیب نہیں دیتا جو دین کے بارے میں اتنے انقلابی (REVOLUTION) ہوں کہ بنیادوں تک کو تبدیل کر دینے میں انہیں کوئی خلش محسوس نہ ہو۔ بے جا نہ ہوگا اگر وسائلِ رزق کے بارے میں ہم مغرب کے ہی ایک گل سرسبد کے خیالات درج کر دیں۔

"انسان وسائلِ زمین کو گذشتہ پچاس ہزار برس سے مسلسل استعمال کرتا چلا آ رہا ہے۔ لیکن اس دنیا میں جتنے انسان آج بس رہے ہیں اور انہیں جتنی سہولتیں آج میسر ہیں کبھی نہیں ہوئیں، اور دورِ جدید میں ان ذرائع و وسائل کو بڑھانے کے لیے حالات جس قدر دورِ حاضر میں روشن نظر آتے ہیں کبھی پہلے نہ تھے۔ اگر ہم کلاسیکی معیشت دانوں اور مالتھس کے متعقدین کے مطابق یہ تسلیم کر لیتے کہ زمین کی بنیادی خصوصیات میں گذشتہ پچاس ہزار سالوں میں کوئی

تبدیلی نہیں ہوئی تو پھر انسان اب تک دنیا سے ناپید ہو چکے ہوتے۔ حقیقت اس نظریہ کے بالکل برعکس ہے۔ انسان کے پاس گذشتہ پانچ سو صدیوں کے مقابلے میں ذرائع و وسائل نسبتاً کہیں زیادہ ہیں کیونکہ اُس کی علمی اور فنی تحقیقات نے اسے قدرت کے ان عطیات سے فائدہ اٹھانے کے نئے نئے طریقوں سے بہتر طور پر آشنا کر دیا ہے۔ اور جتنی سرعت کے ساتھ یہ وسائل ختم ہو رہے ہیں اس سے کہیں زیادہ برق رفتاری کے ساتھ وہ ان نئے نئے طریقوں کو دریافت کر رہا ہے۔"

(ڈبلیو، ہیچ، یونیورسٹی آف کراچی)

اس کتاب کے بعض پہلو بڑے ہی افسوسناک ہیں۔ ان میں بعض تو اس نوعیت کے ہیں کہ عقل انہیں باور نہیں کر سکتی۔ یہ شاید تجدد پسندی کا اثر ہے کہ اس میں دین کی بعض بنیادی تعلیمات تک کا مذاق اُڑایا گیا ہے۔ اور حیرت یہ ہے کہ اس کام میں سب سے زیادہ حصہ ایک عالمِ دین کا ہی ہے

کتاب کے صـ۲۹ پر تقدیر کے بارے میں چند فقرے دیئے گئے ہیں جو در حقیقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ہیں۔ مثلاً "توکل علی اللہ اصل ایمان ہے"، "اسباب کی بجائے مسبب الاسباب پر بھروسہ رکھنا چاہیے اور آنے والی روح تو بہر حال آ کر رہتی ہے"۔ دین کے اندر مسئلہ تقدیر کو جو مقام حاصل ہے اُس سے کون سا مسلمان ناواقف ہے۔ اس کے متعلق شاہ صاحب فرماتے ہیں:

"جذباتی اور خوش اعتقادانہ تصورات تو یہی ہوتے ہیں" (صـ۲۹)

مولانا محترم ضبطِ تولید کے معاملے میں جذبات سے اتنے مغلوب ہو گئے ہیں کہ انہوں نے بعض روزمرہ کے مشاہدات سے بھی صرفِ نظر کر لیا ہے۔ معیشت کی بنیادی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

"قوم کو صرف اخلاقی درس اور وہ بھی یک طرفہ درس دینا بے کار ہے۔ اسے پہلے

اپنے وجود کو باقی رکھنے کے لیے معاشی سہارا بھی چاہیے۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اسے نہ کلمہ پڑھایا جاتا ہے، نہ نماز روزہ سکھایا جاتا ہے۔ پہلے اُسے دودھ دیا جاتا ہے ہماری مملکتِ پاکستان بھی اس وقت نوزائیدہ بچہ ہے۔ اسے پہلے معاشی سہارا دیجیے اس کے بعد اخلاقی وعظ فرمائیے"۔ (ص ۵۵)

مسلمانوں کے عام گھروں میں تو سب سے پہلے بچے کے کان میں اذان اور تکبیر ہی کہی جاتی ہے اور اسے اس اعتبار سے سب سے پہلے اخلاقی وعظ ہی سنایا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ تجدد پسندوں کے حلقے میں یہ معاملہ نہ ہوتا ہو۔

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی!

مقالہ نگاروں میں دو حضرات مصری ہیں ان میں سے ایک کو اخوان المسلمین کا رکن بتایا گیا ہے۔ ہمارے دل میں اخوان کی جو قدر و منزلت ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں لیکن اخوان کے ہر رکن کے ہر قول و عمل کو ہم معیارِ حق و باطل نہیں قرار دے سکتے۔

نامناسب نہ ہوگا اگر بات ختم کرنے سے پیشتر ہم ایک آدھ مثال اُس طرزِ استدلال کی بھی پیش کر دیں جس سے اس کتاب میں فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

فاضل مقالہ نگار تحدید نسل کے حق میں مندرجۂ ذیل حدیث سے جواز حاصل کرتے ہیں:

"بروزِ حشر ان دو انگلیوں — انگشتِ شہادت اور بیچ کی انگلی — کی طرح میں اور وہ بیوہ عورت قریب قریب ہوں گے جو عزت و حسن رکھنے کے باوجود اپنے بن باپ کے بچوں کی خاطر (عقدِ ثانی سے) اس وقت تک باز رہے جب تک وہ بڑے ہو جائیں یا بتقضائے الٰہی فوت ہو جائیں اور ان کی خدمت کرتے کرتے اس کے چہرے کا رنگ بدل جائے۔" (ص ۴۹)

پھر اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد شاہ صاحب فرماتے ہیں:

"ظاہر ہے کہ عقدِ ثانی نہ کرنا مزید اولاد کو وجود میں آنے سے روکنا ہے لیکن

اسے یہاں پسندیدہ الفاظ سے یاد کیا گیا ہے بشرطیکہ مقصد موجودہ اولاد کی عمدہ تربیت ہو۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ مناکحت کا مقصد محض کثرتِ اولاد نہیں بلکہ تربیتِ اولاد ہے۔ اگر اولاد تھوڑی مگر تربیت یافتہ ہو تو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ کثیر تعداد میں ہو اور تربیت کا کوئی سامان نہ ہو۔ پس آج بھی اگر زندوں کو زندہ رکھنے کی خاطر مزید روحوں کو آنے سے روک دیا جائے تو یہ کوئی گناہ نہیں بلکہ قربِ نبوی کا ذریعہ ہے۔ کیونکہ مقصد بے شمار افراد پیدا کرنا نہیں بلکہ ایسے افراد پیدا کرنا ہے جو معاشرے کے لیے باعثِ فخر ہوں، خواہ وہ تعداد میں کم ہی کیوں نہ ہوں۔"

صد ۴۹

قیاس کن ز گلستانِ من بہار مرا

پوری کتاب اسی قسم کے عجیب و غریب دلائل سے بھری پڑی ہے۔

(بقیہ اشارات)

دوسرے کسی تصور کو موثر تو ڑ کر پیش کرنے کی بھی کچھ حدود و قیود ہوتی ہیں۔ خصوصاً جہاں نظریات بالکل متصادم ہوں وہاں اُن کے مابین ہم آہنگی پیدا کرنا بہت ہی مشکل امر ہے۔ یہی معاملہ اسلام اور مغربی تہذیب کا ہے۔ ان دونوں کے درمیان اتنا بُعد ہے کہ کسی قسم کی حیلہ سازی اُس خلیج کو پاٹ نہیں سکتی جو ان دونوں کے درمیان حائل ہے۔ اس لیے جب بھی اسلام کے کسی شعبے میں اجتہاد کے نام سے تبدیلیوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو پہلے قدم پر ہی بے شمار رکاوٹیں پیش آنا شروع ہو جاتی ہے۔ اور ایک عام نوجوان یہ سوچتا ہے کہ جس منزلِ مقصود کی طرف ہم نے اتنی تگ و دو کے بعد جانا ہے، کیوں نہ اُسے شروع ہی سے قبول کرلیں۔ اس لیے وہ بالکل آغاز ہی میں اسلام کا جُوا اتار کر مغرب کی غلامی کا طوق بڑی بے تکلفی سے اپنے گلے میں ڈال لیتا ہے۔

اعلان

رسالہ "ترجمان القرآن" کے ایجنٹ حضرات کی خدمت میں گذارش ہے کہ اگر اُن کے پاس رجب ۷۵ھ مطابق مارچ ۵۶ء اور جون ۶۰ء تا اگست ۶۰ء کے بچے ہوئے پرچے ہوں تو اُسی کمیشن پر جس پر انہوں نے ترجمان کے دفتر سے منگوائے تھے رجسٹرڈ ارسال کردیں۔ پرچوں کی جو رقم بنے گی آنے والے پرچوں سے منہا کردی جائے گی۔

چراغ الدین

منیجر ترجمان القرآن، اچھرہ

لاہور

صفحه خالی

۱- اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

از

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

* یہ وہ کتاب ہے جس کی ضرورت خود مولانا مودودی صاحب نے آج سے ۳۰/۲۵ برس قبل محسوس فرمائی اور اپنے رسالہ ترجمان القرآن میں اس موضوع پر ایک سلسلہ مضامین شروع کیا ۔ لیکن خدا کی قدرت کہ اس سے پہلے اس کی تکمیل کی نوبت نہ آئی

* آج سے چند سال قبل جب مولانا کو پھانسی کی کوٹھڑی سے نکال کر چودہ سال کے لئے جیل میں بند کر دیا گیا تو ان مضامین کا مجموعہ ۱۹۵۵ء میں غیر مکمل صورت میں شائع کر دیا گیا جو جلد ہی ختم ہو گیا ۔

* اب مولانا نے ان مضامین پر نظر ثانی کر کے ان کو مکمل بھی کر دیا ہے اور بعض حصوں کو دوبارہ لکھا ہے جس سے کتاب کی افادیت بھی اور ضخامت بھی پہلے سے بہت بڑھ گئی ہے

* یہ بات دعوے سے کہی جا سکتی ہے کہ "اسلامی تہذیب" پر اس سے بہتر، مستند، قابل اعتماد اور عام فہم کوئی کتاب موجود نہیں ہے ،

عمدہ کتابت و طباعت ۔ کتابی سائیز کے ۳۶۸ صفحات

مضبوط جلد ۔ آرٹ پیپر کا دیدہ زیب گرد پوش ۔ قیمت ساڑھے چار روپے

★

۲- اسلام اور ضبط ولادت

از

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

اس کتاب سے آپ کو نہ صرف یہ معلوم ہوگا کہ اسلام میں برتھ کنٹرول کی حیثیت کیا ہے، بلکہ یہ بھی علم ہو جائے گا کہ اس تحریک کی جو معاشی اور دوسری برکات گنائی جاتی ہیں ان کی خود اس تحریک کے بانی ملکوں کے اپنے اعداد و شمار کی رو سے کیا حقیقت ہے اور اخلاقی اور جسمانی صحت کے لحاظ سے اس عمل نے ان کو کہاں پہنچا دیا ہے ۔

عمدہ کتابت و طباعت ۔ خوبصورت رنگین ٹائیٹل

کتابی سائیز کے ۸۴ صفحات ۔ قیمت ایک روپیہ

اپنے قریبی کتب فروش سے یا صرف تین پیسے کا پوسٹ کارڈ لکھ کر ہم سے بذریعہ وی۔پی طلب کیجئے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ۱۱۔سی شاہ عالم مارکیٹ لاہور